سورۂ یوسف

آیاتھا ۱۱۱　۱۲ سورۃ یوسف مکیۃ ۵۳　رکوعاتھا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یہ پوری سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: سوائے چار آیات کے یہ مکی ہے روایت ہے کہ یہود نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو یہ سورت نازل ہوئی۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو نازل فرمایا تو آپ نے ایک لمبا عرصہ اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ ہمارے سامنے قصہ بیان کرتے (1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ۔ تو آپ نے ایک لمبا عرصہ لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ کوئی بات بیان کرتے، تو اللہ نے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ (الزمر: 23) نازل فرمائی۔ علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انبیاء کے قصص کو ذکر فرمایا۔ اور بلاغت کے درجات کے اعتبار سے مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف طریقوں سے ایک ہی معنی میں ان کا تکرار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قصہ یوسف کو ذکر فرمایا اور اس کا تکرار نہیں فرمایا تو کوئی مخالف نہ تو تکرار والے قصص کا مقابلہ کر سکا اور نہ ہی قصہ غیر متکررہ کا مقابلہ کر سکا۔ جس نے بھی اس میں غور وفکر کیا اس کے لیے اس میں اعجاز ہے۔

الٓرٰ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝۱

''الف۔لام۔را۔ یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی''۔

الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ یہاں تقدیر عبارت: تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ ہے۔ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ الٓرٰ سورت کا نام ہے یعنی یہ سورت جس کا نام الٓرٰ ہے یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی، کتاب مبین سے مراد قرآن مبین ہے یعنی جس کا حلال، حرام (2)، اس کی حدود، اس کے احکام، اس کی ہدایت اور اس کی برکت واضح ہے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی یہ وہ آیات ہیں جن کا تمہارے ساتھ تورات میں وعدہ کیا گیا تھا۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۲

''بے شک ہم نے اتارا اسے یعنی قرآن عربی کو تاکہ تم (اسے) خوب سمجھ سکو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے: انا انزلنا القرآن عربیا (یعنی ہ ضمیر سے مراد قران

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 219　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 5

ہو) قُرْءٰنًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی سارا قرآن (عربی ہے) اور عَرَبِيًّا، قُرْءٰنًا کی صفت ہوگا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قُرْءٰنًا بطور تمہید و تاکید حال ہو جیسے مررت بزید رجلا صالحا اور عَرَبِيًّا ضمیر سے حال ہوگا، یعنی اے گروہ عرب اس کو تمہاری زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ أعرب سے مراد بین ہے اسی سے الثَّيِّبُ تُعرِب عن نفسها (1) ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یعنی تاکہ تم اس کے معانی کو جانو اور جو کچھ اس میں ہے اسے سمجھو۔ بعض عرب لعل کے ساتھ أن لاتے ہیں عسی کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے لعل میں لام تاکید کے لیے زائد ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

یا أبَتَا عَلَّكَ أو عَسَاكَا

اس میں لعل کے بجائے علّ ہے۔

ایک قول یہ ہے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ سے مراد یہ ہے لتکونوا علی رجاء من تدبرہ یعنی تاکہ اس کے غور و فکر سے تم پر امید ہو جاؤ، پس شک کا معنی ان کفار کی طرف راجع ہوگا نہ کہ کتاب اللہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور ایک قول یہ ہے: اَنْزَلْنٰهُ کا معنی ہے کہ ہم نے خبر یوسف علیہ السلام کو نازل کیا (2)۔ نحاس نے کہا: یہ معنی کے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ روایت ہے کہ یہود نے کہا: اس (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھو کہ آل یعقوب شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے؟ اور اس سے یوسف کی خبر کے بارے میں سوال کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت مکہ میں نازل فرمائی ان تعلیمات کے مطابق جو تورات میں تھیں۔ اور اس میں ان کے پاس موجود خبروں کی نسبت کچھ زیادہ خبریں تھیں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے ہی تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردہ کو زندہ کرنا کیونکہ آپ نے ان کو خبر دی حالانکہ آپ کبھی بھی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ کتاب والی جگہ میں تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③

”ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ایک بہترین قصہ اس قرآن کے ذریعہ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے، اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے“۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ مبتدا اور خبر ہے۔ اَحْسَنَ الْقَصَصِ یہ مصدر کے معنی میں ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: قصصنا أحسن القصص۔ قصص کی اصل کسی چیز کے پیچھے چلنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (القصص: 11) ہے یعنی اس کے نشان قدم کی اتباع کر۔ پس قصہ گو آثار کی اتباع کرتا ہے اور ان کے متعلق خبر دیتا ہے۔ اور حسن قصص کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ قصہ کی طرف۔ کہا جاتا ہے فلان حسن الاقتصاص للحدیث یعنی اس کا سیاق عمدہ ہوتا ہے۔

ایک قول یہ ہے: قصص مصدر نہیں بلکہ یہ اسم کے معنی میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: اللہ رجاءنا یعنی مرجونا۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا: ہم آپ کو عمدہ خبروں کے ذریعے خبر دیتے ہیں۔ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ یعنی ہماری وحی کے ذریعے پس ما فعل کے ساتھ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب استئمار البکر والثیب، حدیث نمبر 1861، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 6

ھٰذَا الْقُرْاٰنَ، القران ھذا کی صفت ہونے کی وجہ سے یا اس سے بدل ہونے کے سبب یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے فراء نے اس کی جر کو بھی جائز کہا ہے۔ اس نے کہا: تکریر کی بنیاد پر مجرور ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک ما سے بدل کی بنیاد پر ہے۔ ابو اسحاق نے مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر اس کے رفع کو بھی جائز کہا ہے۔ وہ سائل تھا اس نے آپ سے وحی کے متعلق پوچھا تو اس کو کہا گیا: ھو القران۔ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ یعنی جو ہم نے آپ کو بتایا اس سے غافلین میں سے۔

مسئلہ۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کو باقی تمام قصص میں سے احسن القصص کیوں کہا گیا؟ ایک قول یہ ہے: کیونکہ قران میں کوئی ایسا قصہ نہیں جس میں وہ عبرتیں اور حکمتیں ہوں جو اس قصہ میں ہیں۔ اور اس کا بیان اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے بھائیوں کو درگزر کرنے، ان کی اذیتوں پر آپ کے صبر، ان کا آپ کو کنویں میں لٹکانے کے بعد آپ کا ان کو معاف کرنا اور ان کو معاف کرنے میں آپ کے کرم کے حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام احسن القصص رکھا ہے حتیٰ کے آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں انبیاء، صالحین، فرشتوں، شیاطین، جن، انسان، جانور، پرندے، بادشاہوں کی سیرت، مختلف ممالک، تاجر، علماء، جاہل، مردوں، عورتوں اور ان کے حیلوں اور فریبوں کا ذکر ہے اور اس میں توحید، فقہ، بین الاقوامی قانون، خوابوں کی تعبیر، سیاست، معاشرت، تدبیر معاش کا اور ان تمام فوائد کا ذکر ہے جو دین و دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں حبیب، محبوب اور ان دونوں کی سیرت کا تذکرہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں اَحْسَنَ بمعنی أعجب ہے۔ بعض اہل معانی نے کہا: اَحْسَنَ الْقَصَصِ اس وجہ سے ہے کہ ہر وہ شخص جس کا اس میں ذکر ہے اس کا انجام سعادت تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو، آپ کے باپ، آپ کے بھائیوں اور عزیز مصر کی بیوی کو دیکھو۔ اور ایک قول یہ ہے: بادشاہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے اسلام لایا اور اس کا اسلام عمدہ تھا۔ اور خوابوں کی تعبیر چاہنے والا ساقی اور گواہ ان تمام کا معاملہ بھلائی پر ہی مبنی تھا۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝

"(یاد کرو) جب کہا یوسف نے اپنے والد سے کہ اے میرے (محترم) باپ! میں نے (خواب میں) دیکھا ہے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو میں نے انہیں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ، اِذْ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے،۔ یعنی انہیں یاد کراؤ جب یوسف نے کہا۔ عام قُراء کی قرأت سین کے ضمیر کے ساتھ ہے۔ طلحہ بن مصرف نے یوسف پڑھا ہے ہمزہ اور سین کے فتح کے ساتھ عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی ہے۔ ابو الحسن الاقطع جو کہ حکیم تھا اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا: لغت میں أسف حزن کو کہتے ہیں اور أسیف کا معنی بندہ ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت یوسف علیہ

السلام میں جمع تھیں اس وجہ سے آپ کو یوسف کہا گیا۔ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ ابوعمرو، عاصم، نافع، حمزہ اور کسائی کی قرأت ''تا'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک تانیث کی علامت ہے، بالخصوص ندا میں اَب پر یا اضافت کے بدلے داخل ہوتی ہے۔ بعض اوقات مذکر پر علامت تانیث داخل ہوتی ہے پس کہا جاتا ہے: رجل نكحة و هزأة۔

نحاس نے کہا: جب آپ يٰۤاَبَتِ تا کے کسرہ کے ساتھ کہتے ہیں تو اس میں ''تا'' سیبویہ کے نزدیک یا اضافت کے بدلے میں ہے۔ سیبویہ کے قول کے مطابق ھا کے بغیر وقف جائز نہیں اور ان کے پاس اپنے قول پر کئی دلائل موجود ہیں جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کا قول: یا ابه، یا أبی کا معنی دیتا ہے اور يٰۤاَبَتِ صرف معرفہ کی صورت میں کہا جا سکتا ہے جاءنی أبت نہیں کہا جا سکتا۔ اور عرب اس کو بالخصوص ندا میں ہی استعمال کرتے ہیں یا أبتی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ''تا'' ''یا'' کا بدل ہے لہٰذا دونوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ جب کوئی آدمی يٰۤاَبَتِ کہے تو اس کا کسرہ ''یا'' پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ اس وقت نیت میں ''یا'' موجود ہے ابواسحاق کا گمان یہ ہے کہ یہ غلط ہے اور صحیح بات وہ ہے جو اس نے کی کہ ''یا'' نیت میں کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ یا أبتی نہیں کہا جا سکتا۔ ابوجعفر، اعرج اور عبداللہ بن عامر نے یا أبت، تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ان قراء کی قرأت اصل میں یا أبتی یا کے ساتھ ہے پھر ''یا'' کو الف کے ساتھ بدل دیا گیا تو یا أبتا ہو گیا تو الف کو حذف کر دیا گیا اور ''تا'' پر فتح باقی رہ گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اصل کسرہ ہے، پھر کسرہ کو فتحہ سے بدل دیا گیا جس طرح ''یا'' کو الف سے بدل دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: یا غلاما أقبل۔ فراء نے یا أبتُ تا کے ضمہ کے ساتھ بھی قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا نحویوں کے درمیان: جاءنی احد عشر رایت و مررت باحد عشر، اسی طرح ثلاثة عشر، تسعة عشر اور ان دونوں اعداد کے درمیان والوں کا اس طرح پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں، انھوں نے کہا: دونوں اسموں کو ایک اسم بنا دیا اور ان دونوں کو خفیف ترین حرکات کے ساتھ اعراب دیا۔ سہیلی نے کہا: ان ستاروں کے اسماء کا ذکر مستند روایت میں آیا ہے جس کو حرث بن أبی أسامہ نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: بستانہ۔ جو کہ اہل کتاب میں سے ایک آدمی ہے۔ آیا، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان گیارہ ستاروں کے بارے میں پوچھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حرثان، طارق، ذیال، قابس، مصبح، ضروح، ذوالکنفات، ذوالقرع، فلیق، وثاب اور عمودان (1)۔ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا''۔ حضرت ابن عباس (2) اور حضرت قتادہ نے فرمایا: کواکب سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی، شمس سے مراد آپ کی ماں اور قمر سے مراد آپ کے باپ ہیں۔ حضرت قتادہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ شمس سے مراد آپ کی خالہ ہے، کیونکہ آپ کی ماں تو فوت ہو چکی تھی اور آپ کی خالہ آپ کے باپ کے نکاح میں تھی۔ رَاَيْتُهُمْ تاکید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ھم ضمیر مذکر آئی ہے۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک بات یہ ہے کہ جب آپ نے ان اشیاء کے بارے میں اطاعت اور سجدے کی خبر دی اور یہ دونوں فعل ذوی العقول کے ہیں تو ان کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 180 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 181

بارے میں اس طرح خبر دے دی جس طرح ذوی العقول کے بارے میں خبر دی جاتی ہے۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ (الاعراف: 198) میں گزر چکا ہے اور عرب جب غیر ذوی العقول کو ذوی العقول کے مقام پر لے آئیں تو اس کی جمع ذوی العقول کی طرح لاتے ہیں اگر چہ یہ خارج الاصل ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''آپ نے فرمایا: اے میرے بچے! نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں سے ورنہ وہ سازش کریں گے تیرے خلاف، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا یعنی وہ آپ کو ہلاک کرنے کی سازش کریں گے، کیونکہ اس کی تاویل ظاہر ہے بعض اوقات شیطان ان کو آپ کے ساتھ برائی پر ابھارتا ہے لَكَ میں لام تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ (یوسف) میں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ خواب ایک شریف حالت اور بلند مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد مبشرات میں سے صرف سچے، نیک خواب باقی رہ گئے ہیں جن کو نیک آدمی دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں''(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو از روئے خواب کے زیادہ سچا ہوگا وہی از روئے کلام کے بھی زیادہ سچا ہوگا''(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کے بارے میں حکم بیان فرمایا کہ یہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق: ''نبوت کے ستر اجزاء میں سے (چھیالیسواں حصہ ہے)''(3)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث کے مطابق: ''چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''(4)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''چھبیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''نبوت کے چوالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے'' ان میں سے صحیح چھیالیس والی حدیث ہے۔ اس کے بعد صحت میں حدیث سبعین (ستر والی حدیث) ہے۔ امام مسلم نے سوائے ان دو حدیثوں کے اور کوئی نقل نہیں کی، جہاں تک ان سب احادیث کا تعلق ہے تو یہ شیوخ کی احادیث میں سے ہیں یہ ابن بطال کا قول ہے۔ ابو عبداللہ مازری نے کہا: محدثین کے نزدیک اکثر اور اصح من ستة واربعين ہے(5)۔ (چھیالیس والی حدیث) طبری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ ساری احادیث یا ان میں سے اکثر صحیح ہیں، اور ان میں سے ہر حدیث کا مخرج معقول ہے، جہاں تک أنها جزء من سبعين جزأ من النبوة کا تعلق ہے تو یہ ہر سچے اور نیک خواب کے بارے میں اور ہر مسلمان کے بارے میں جو اس خواب کو اپنی نیند کی حالت میں دیکھے اس

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185 — 2۔ صحیح مسلم، باب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241 — 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 242
4۔ جامع ترمذی، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 52 — 5۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

کے لیے عام بات ہے خواہ وہ مسلمان جس بھی حالت میں ہو، جبکہ أنها من أربعين أو ستة وأربعين اس سے مراد اس آدمی کا خواب ہے جس کی حالت کا ذکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس ہوا یعنی جو سخت سردیوں میں وضو کو انتہائی عمدہ طریقے سے کرنے والا ہو، ناپسندیدہ باتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبر کرنے والا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنے والا ہو تو اس کا نیک خواب اگر اللہ نے چاہا تو نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ اور جس آدمی کی حالت ان دونوں حالتوں کے درمیان ہو اس کا سچا خواب بھی ان دونوں اجزاء کے درمیان والی کیفیت میں ہوگا یعنی چالیس سے ستر تک کے درمیان۔ ستر سے کم نہیں ہوگا اور چالیس سے زیادہ ہوگا۔ اسی معنی کی طرف ابوعمر بن عبداللہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: خواب کے اجزاء کی تعداد کے بارے میں آثار میں پایا جانے والا اختلاف میرے نزدیک کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ خواب دیکھنے والا شخص جس طرح کلام کے صدق، امانت کی ادائیگی، دین متین اور حسن یقین کی قوت سے لبریز ہوگا اسی قدر اس کا خواب نبوت کے مختلف اجزاء کی تعداد کے مطابق ہوگا۔ پس جس قدر بندے کی نیت اپنے رب کی عبادت میں خالص ہوگی اس کا یقین پختہ ہوگا اور اس کا کلام سچا ہوگا اسی قدر اس کا خواب زیادہ سچا اور نبوت کے زیادہ قریب ہوگا۔ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو باہمی فضیلت حاصل ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ (الاسراء: 55) ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل بہت ساری احادیث کو جامع ہے اور یہی تاویل بہتر ہے بنسبت بعض کی بعض کے ساتھ تفسیر کرنے اور بعض کو چھوڑ دینے کے۔ أبوسعید الاسفاقیسی نے بعض اہل علم سے جزء من ستة وأربعين جزأ من النبوة کا یہ معنی ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں تئیس سال تک وحی فرمائی ہے جس طرح کہ عکرمہ اور عمرو بن دینار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے تو اگر ہم تئیس سال کے عرصے کو چھ ماہ کے حساب سے تقسیم کریں تو اس کے چھیالیس اجزاء بن جائیں گے۔ اسی قول کی طرف مازری نے اپنی کتاب ''المعلم'' میں اشارہ کیا ہے اور اس کو القونوی نے اپنی تفسیر میں ''سورۂ یونس'' کی آیت کریمہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (یونس: 64) کے تحت اختیار کیا ہے مگر یہ مؤقف دو اعتبار سے فاسد ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ أبو مسلمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ مدت بیس سال تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کے آخر میں ہوئی پھر دس سال آپ نے مکہ میں قیام فرمایا یہ عروہ، شعبی، ابن شہاب، حسن، عطاخراسانی اور سعید بن مسیب کے مختلف اقوال سے ثابت ہے اور یہی ربیعہ اور ابو غالب کی روایت ہے حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے پس اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو پھر یہ تأویل باطل ہو جائیگی۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ پھر اجزاء مختلفہ کے بارے میں وارد تمام احادیث بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

مسئلہ نمبر 3۔ صرف خواب نبوت کے اجزاء میں سے تھا کیوں کہ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو عاجز کرتی ہیں اور مانع ہوتی ہے جس طرح کہ پرواز کرنا، ایمان کو بدل دینا اور علم غیب میں سے کسی چیز پر مطلع ہونا، جیسا کہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''نبوت کی مبشرات میں سے سوائے نیند کے سچے خواب کے کوئی شے باقی نہیں رہی (1)۔ الحدیث المختصر سچا خواب الله تعالیٰ کی طرف سے اور نبوت کے اجزاء میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواب الله کی طرف سے ہے اور پریشان خواب شیطان کی طرف سے'' (2)۔ اس بات کی تصدیق حق ہے اور اس کی عمدہ تاویل ہے اور بعض اوقات بعض چیزوں کی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور خواب میں الله تعالیٰ کے بدیع ہونے اور اس کی مہربانی کے ایسے دلائل ہوتے ہیں جو بندہ مومن کے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل دین اور اہل حق میں سے اہل رائے اور محدثین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور سوائے معتزلہ میں سے ملحد اور بے دین لوگوں کے خواب کا کوئی بھی منکر نہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: جب سچا خواب نبوت کے اجزاء میں سے ہے تو پھر کافر، جھوٹا اور خلط ملط کرنے والا اس کا اہل کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بعض کفار اور دیگر ایسے لوگوں سے جن کا دین پسندیدہ نہیں ان سے بھی صحیح اور سچے خواب کا ظہور ہوا ہے جس طرح اس بادشاہ کا خواب جس نے خواب میں سات گائیں دیکھیں، قید خانے میں دونوں جوانوں کے خواب، بخت نصر کا وہ خواب جس کی تعبیر دانیال نے اس کی بادشاہت کے جانے کے ساتھ کی، ظہور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کسریٰ کا خواب اور عاتکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کا آپ کے بارے میں خواب حالانکہ وہ کافرہ تھی اسی طرح امام بخاری نے باب رؤیا اهل الجن کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر، فاسق، فاجر اور جھوٹے آدمی کا خواب اگرچہ بعض اوقات وہ سچا بھی ہوتا ہے وہ وحی اور نبوت میں سے نہیں ہے، کیونکہ ہر وہ آدمی جس کی غیب کی بات سچی ہو اس کی بات اور خبر نبوت میں سے نہیں ہوتی اس کی تفصیل ''سورۃ الانعام'' میں گزر چکی ہے کہ کاہن اور دیگر لوگ بعض اوقات سچی خبر دیتے ہیں لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تو اس طرح ان کے خوابوں کی بھی کیفیت ہوتی ہے۔ مہلب نے کہا: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ عنوان صرف اس لیے قائم کیا ہے تا کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ مشرکین کے خواب بھی سچے ہو سکتے ہیں جس طرح کہ دونوں جوانوں کے خواب سچے تھے مگر یہ درست نہیں کہ مومنین کے خوابوں کی طرح ان کے خوابوں کی نسبت نبوت کی طرف کی جائے، کیونکہ ہر وہ بات جس کی سچی تاویل کرنا ممکن ہو اس کا نبوت کے اجزاء میں سے ہونا ضروری نہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ الله تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے والے خواب وہ ہوتے ہیں جو پریشانی اور وہم سے خالی ہوں اور ان کی تاویل لوح محفوظ میں مرقوم تقدیر کے موافق ہو۔ وہ خواب جو اضغاث کی خبر میں سے ہوں وہ پریشان کن افکار ہیں جن کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ شیطان کی طرف منسوب ہوتے ہیں انہیں کو ضغث کہا جاتا ہے، کیوں کہ ان میں متضاد چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کا معنی مہلب نے بیان کیا ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں جو ہر قائل کے قول سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''خواب تین ہیں ان میں سے ایک شیطان کے احوال ہیں تا کہ وہ ابن آدم کو پریشان کرے اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں کہ جو حالات حالت بیداری میں بندے کو درپیش ہوتے ہیں انہی کو وہ خواب میں دیکھتا ہے اور کچھ وہ خواب ہیں جو نبوت کے

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185 2۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہیں''(1)۔ سننے والے نے کہا کہ میں نے کہا: آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ الآیۃ۔ الرؤیا، رأی فی المنام سے مصدر ہے، رؤیا فعلی کے وزن پر ہے سقیا اور عشری، اس کا الف تانیث کا ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ علماء کا رؤیا کی حقیت میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایسے اجزا کا ادراک ہے جن کو آفت نہیں آتی جس طرح متفرق نیند وغیرہ۔ اسی وجہ سے نیند کے غلبہ کی قلت کے سبب اکثر خواب رات کے آخری حصہ میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خواب دیکھنے والے کے لیے علم ناشی پیدا فرماتا ہے اور دیکھنے والے کے لیے اس کے مشاہدے کے مطابق اس کو پیدا فرماتا ہے تاکہ ادراک صحیح ہو جائے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: خواب میں صرف وہی دکھایا جاتا ہے جس کا ادراک حالت بیداری میں صحیح ہو(2)۔ اسی وجہ سے خواب میں کوئی آدمی کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے کسی حالت میں نہیں دکھایا جاتا اور صرف معتاد چیزیں ہی دکھائی جاتی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو سونے والے کے محل مدرک میں دیکھی جانے والی چیزیں پیش کرتا ہے اور پھر اس کو محسوس صورتوں کی تمثیل دیتا ہے۔ کبھی وہ صورتیں پائی جانے والی چیزوں کے موافق تمثیلی صورت اختیار کرتی ہیں اور کبھی وہ عقل کے ذریعے سمجھے جانے والے غیر محسوس معانی کی صورت اختیار کرتی ہیں، البتہ دونوں حالتوں میں وہ بشارت دینے والی یا ڈرانے والی ہوتیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے، صحیح مسلم اور دیگر کتب میں: ''میں نے سیاہ پراگندہ سر (عورت) کو دیکھا جو مدینہ سے مہیعہ (جحفہ کا مقام جو اہل شام کا میقات ہے) تک نکلتی ہے پس میں نے اس کی تعبیر بخار کے ساتھ کی ہے''(3)۔ اور ''میں نے اپنی تلوار کو دیکھا جس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اور گائے کو دیکھا جس کا نحر کیا جاتا ہے تو میں نے ان دونوں کی تعبیر یہ کی ہے کہ میرے اہل بیت کے آدمی کو شہید کیا جائے گا اور گائے میرے صحابہ کی ایک جماعت ہے جن کو شہید کیا جائے گا''(4)، اور ''میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ ذرع میں داخل کیا ہے تو اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی ہے۔'' اور ''میں نے اپنے ہاتھ میں دو کنگن دیکھے تو ان دونوں کی تعبیر میں نے دو کذابوں سے کی جو میرے بعد نکلیں گے''(5)۔ علاوہ ازیں ایسے خواب جن کی تمثیل ہو سکتی ہے۔ اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں جن کے معنی پہلے ہی ظاہر ہوتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کے معنی غور و فکر کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر سالوں سے کی اور آپ نے گیارہ ستارے، سورج اور چاند کو دیکھا تو ان کی تعبیر اپنے بھائیوں اور اپنے والدین سے کی۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: حضرت یوسف علیہ السلام اپنی خواب کے وقت چھوٹے تھے اور صغیر کے فعل پر کوئی حکم نہیں لگایا جاتا تو آپ کا خواب ایسا کس طرح ہو گیا کہ جس پر حکم لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ آپ کے والد نے فرمایا: لَا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1073، ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب تعبیر الرؤیا، باب الرؤیا ثلاث، حدیث نمبر 3896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1074
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1042
4۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 244
5۔ جامع ترمذی، تعبیر الرؤیا، جلد 2، صفحہ 53

تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خواب ایک حقیقت کا ادراک ہے، جس طرح کہ پہلے بیان ہوا تو یہ صغیر سے بھی ہوسکتا ہے جس طرح اس سے حالت بیداری میں ادراک حقیقی ممکن ہے اور جب وہ اپنی دیکھی ہوئی چیز کی سچی خبر دے تو یہی کیفیت ہوگی جب وہ ایسی چیز کی خبر دے جس کو اس نے حالت خواب میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب کے بارے میں خبر دی اور یہ خواب آپ کے مشاہدہ کے مطابق پایا بھی گیا تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔

مسئلہ نمبر 8۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ خواب غیر شفیق اور غیر مخلص آدمی کے سامنے بیان نہ کیا جائے اور نہ ہی ایسے آدمی کے سامنے اس کو بیان کیا جائے جو خواب کی تعبیر عمدہ طریقے سے نہیں کر سکتا۔ ابورزین عقیلی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور خواب پرندے کی ٹانگ کے ساتھ تب تک معلق رہتا ہے جب تک کہ خواب دیکھنے والا اس کو بیان نہ کرے اور جب وہ اس کو بیان کرے تو وہ واقع ہو جاتا ہے سو تم سوائے عقلمند، محبت کرنے والے اور مخلص آدمی کے کسی کے سامنے اس کو بیان نہ کرو'' (1)۔ امام ترمذی نے اس کو روایت کیا اور اس کے بارے میں آپ نے کہا: حدیث حسن صحیح۔ ابورزین کا نام: لقیط بن عامر ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا ہر ایک خواب کی تعبیر کرسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا نبوت کے ساتھ کھیلا جا سکتا ہے؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی خواب کی تعبیر نہ کرے سوائے ایسے آدمی کے جو عمدہ طریقے سے تعبیر کرسکتا ہے۔ اگر اس میں کوئی بھلائی دیکھے تو اس کی خبر دے اور اگر اس میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو یا تو اچھی بات کرے یا پھر خاموشی اختیار کرے۔ ایک قول یہ ہے: کیا تعبیر کرنے والا اس کی اچھی تعبیر کرسکتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں پھر آپ نے کہا: خواب نبوت کا حصہ ہے لہٰذا نبوت کے ساتھ نہ کھیلا جائے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کو کسی خوفناک چیز سے ڈرانا مباح ہے اور یہ غیبت کے معنی میں داخل نہیں کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے ڈرایا کہ وہ اپنی سازش کریں گے۔ اور اس آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ جس آدمی کو اپنے خاندان میں سے کسی آدمی سے حسد اور سازش کا ڈر ہو اس کے سامنے نعمت کا اظہار نہ کرنا جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی ضروریات کو چھپانے کے ذریعے مدد طلب کرو کیونکہ ہر نعمت والے آدمی کے ساتھ حسد کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کو جاننے پر بھی واضح دلیل ہے۔ پس انہوں نے اس کی تعبیر کو جان لیا کہ عنقریب وہ تعبیر ان کے سامنے ظاہر ہوگی اور آپ نے اپنے دل میں اس کی پرواہ نہ کی۔ آدمی یہ بات تو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے بہتر ہوگا مگر بھائی اپنے بھائی کے بارے میں یہ نہیں چاہتا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں حسد و بغض کو محسوس کرلیا تھا تو آپ نے ان کو ان کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 52۔ ایضاً، حدیث نمبر 2204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے خواب بیان کرنے سے روک دیا اس خوف سے کہ ان کے سینے اس کے حسد میں جلنے نہ لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کے بارے میں سازش کرنے لگیں۔ یہ وجہ اور ان (بھائیوں) کی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کاروائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اس وقت نبی نہیں تھے۔ ابن زید کی کتاب الطبری میں ہے کہ وہ انبیاء تھے مگر یہ بات دنیوی حسد، والدین کی نافرمانی، مومن کی ہلاکت پر ابھارنے اور مومن کے قتل کا کسی کو حکم دینے سے انبیاء کے محفوظ ہونے کے عقیدے کو قطعی رد کرتی ہے لہٰذا جس آدمی نے ان کے انبیاء ہونے کی بات کی ہے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔ عقل نبی کی لغزش کو محال نہیں سمجھتی البتہ اگر وہ لغزش کبیرہ گناہ کو جامع ہو تو مسلمان کا ان سے انبیاء کے معصوم ہونے پر اجماع ہے، جبکہ صغیرہ گناہوں کے بارے میں مسلمان کا اختلاف ہے جس طرح کہ پہلے بیان ہوا اور بعد میں بھی اس کا بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1) انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''نبوت میں سے سوائے مبشرات کے کوئی چیز باقی نہیں رہی'' انہوں نے کہا: مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نیک خواب''۔ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خواب مطلقاً بشارت ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ بے شک سچا خواب بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا ہے۔ اسے دیکھنے والا خوش نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ مومن کو ایسا خواب اس کے ساتھ مہربانی اور رحمت کرتے ہوئے دکھاتا ہے تاکہ مصیبت سے پہلے اس کے نزول کے لیے بندہ تیاری کرلے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مصر میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں خواب دیکھا جو ان کی محنت پر دلالت کرتا تھا تو آپ نے ان کی طرف یہ خواب لکھا تاکہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں۔ ''سورۂ یونس آیت 64'' میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر گزر چکی ہے کہ اس سے مراد ''نیک خواب ہے'' یہ اور امام بخاری کی حدیث کا مخرج اکثر و اغلب ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ امام بخاری نے ابوسلمہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے خواب دیکھا تو اس نے مجھے بیمار کر دیا حتیٰ کہ میں نے ابوقتادہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: میں خواب دیکھا کرتا تھا تو وہ مجھے بیمار کر دیتا یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جب تم میں سے کوئی کسی پسندیدہ چیز کو دیکھے تو اس کو صرف اسی کے سامنے بیان کرے جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے اور جب وہ کسی ناپسندیدہ بات کو دیکھے تو اسے اس بات کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے۔ اور اسے تین مرتبہ تھوکنا چاہیے اور وہ کسی کو بھی وہ خواب بیان نہ کرے تو اس کو کوئی نقصان نہیں دے گا'' (2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس خواب سے استعاذہ کو اس سے اُذیت کے اٹھ جانے کا باعث بنایا ہے۔ کیا آپ نے اُبوقتادہ کا قول نہیں دیکھا: میں خواب دیکھا کرتا تھا یہ مجھ پر پہاڑ سے زیادہ بوجھل ہوتا۔ جب میں نے یہ حدیث سنی تو میں اس کو کوئی چیز شمار نہیں کرتا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں اضافہ کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اسے تین مرتبہ اپنے بائیں جانب تھوکنا چاہیے تین

1۔ صحیح بخاری، مبشرات، جلد 2، صفحہ 1035
2۔ ایضاً، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1043

مرتبہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے اور جس پہلو پر ہو اس سے اس کو پہلو بدل لینا چاہیے"(1)۔ حضرت ابو ہریرہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے آپ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اٹھے اور نماز پڑھے"(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ سارے کا سارا باہم متعارض نہیں، یہ معاملہ صرف جگہ بدلنے کا ہے اور نماز کا اس میں اضافہ ہے تو خواب دیکھنے والے پر یہ سارے کام کرنا لازم ہیں اور نماز کے لیے اٹھنا ان تمام افعال کو شامل ہے کیونکہ جب وہ نماز پڑھے گا تو نماز کے لیے اس کا عمل تمام امور کو شامل ہوگا کیونکہ جب نماز کے لیے اٹھے گا تو وہ پہلو کو بدلے گا، جب منہ میں پانی ڈالے گا تو تھوکے گا اور جب نماز شروع کرے گا تو تعوذ پڑھے گا، دعا کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس معاملے میں تضرع کرے گا کہ وہ خواب کے شر سے اس کو کافی ہو گا اس کی یہ زاری ایسی حالت میں ہوگی جو قبولیت کے زیادہ قریب ہے اور یہ رات میں صبح سے تھوڑا سا پہلے ہوگا۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞

"اور اسی طرح چن لے گا تجھے تیرا رب اور سکھا دے گا تجھے باتوں کا انجام (یعنی خوابوں کی تعبیر) اور پورا فرمائے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر جیسے اس نے پورا فرمایا اپنا انعام اس سے پہلے تیرے دو بھائیوں ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر، یقیناً تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے"۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ میں کاف ضمیر محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ میں کاف اور ما کافہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَذٰلِكَ یعنی جس طرح اس نے خواب کے ذریعے تجھے عزت عطا فرمائی پس اسی طرح وہ تجھے چن لے گا اور خواب کو سچا ثابت کر کے تیرے اوپر احسان فرمائے گا۔ مقاتل نے کہا: تیرے لیے سجدوں کے ذریعے (تجھے چن لے گا) حضرت حسن نے کہا: نبوت کے ذریعے، اجتباء سے مراد مجتبیٰ کے لیے امور کی بلندی کو اختیار کرنا ہے۔ اس کی اصل جبیت الشیئ ہے یعنی میں نے اس کو حاصل کر لیا۔ اسی سے جبیت الماء فی الحوض ہے، یہ نحاس کا قول ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی تعدید ہے جس طرح زمین میں اقتدار دینا اور خوابوں کی تعبیر کی تعلیم اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ انتخاب خوابوں کی تعبیر کے سلسلہ میں ہے۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تفسیر چالیس سال بعد ہوئی۔ اور یہ خواب کی انتہاء ہے۔

الاحادیث سے مراد وہ ہے جو لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے پس اس میں آپ کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1037
2۔ جامع ترمذی، تعبیر الرؤیا، جلد 3، صفحہ 52

غلطی لاحق نہ ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ جانتے تھے۔ اور ہمارے نبی ﷺ بھی اسی طرح تھے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں میں اس کے سب سے زیادہ تعبیر بتانے والے تھے، ابن سیرین کو اس میں بہت زیادہ تقدم طبع اور احسان حاصل ہوا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ ان جیسے یا ان کے قریب قریب تھے۔ اپنے قول کی تاویل کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ یعنی قوموں اور کتابوں کی گفتگو اور دلائل توحید، یہ نبوت کی طرف اشارہ ہے یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ سے مقصود ہے یعنی نبوت کے ذریعے (وہ اپنی نعمت تیرے اوپر مکمل فرمائے گا) ایک قول یہ ہے: تیرے بھائیوں کا تیری طرف نکلنے کے ساتھ۔ اور ایک قول یہ ہے: تجھے ہر ناپسندیدہ کاروائی سے نجات عطا فرمانے کے ذریعے۔ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ خلت اور آگ سے ان کو نجات عطا فرمانے کے ذریعے وَ اِسْحٰقَ نبوت کے ذریعے۔ ایک قول یہ ہے: ذبح کے ذریعے۔ یہ عکرمہ کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ کے ذریعے آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ تمام بنی یعقوب کو نبوت عطا فرمائے گا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ اس کو جاننے والا ہے جو کچھ وہ تجھے عطا فرمائے گا: حَكِيْمٌ تیرے ساتھ اپنے فعل میں (حکمت والا ہے)۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۚ ۝ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝

”بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصہ) میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں دریافت کرنے والوں کے لیے جب بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے حالانکہ ہم ایک (مضبوط) جتھ ہیں، یقیناً ہمارے والد (ایسا کرنے میں) کھلی غلطی کا شکار ہیں۔ قتل کر ڈالو یوسف کو یا دور پھینک آؤ اسے کسی علاقے میں (یوں) تنہا ہو جائے گا تمہاری طرف تمہارے باپ کا رخ اور ہو جانا اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک قوم“۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ یعنی جس نے ان کی گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ اہل مکہ نے آيَةٌ واحد پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے اٰيٰتٌ جمع کو اختیار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ خیر کثیر ہے۔ نحاس نے کہا: یہاں ’’آية‘‘ عمدہ قرات ہے یعنی جن لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر کے بارے میں ان کو ان کے بارے میں جو خبر دی گئی اس میں ان کے لیے نشانی ہے، کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا اور آپ مکہ میں تھے انہوں نے کہا: ہمیں انبیاء میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں خبر دیجیے جو شام میں تھا، اس کے بیٹے کو مصر لے جایا گیا تو وہ اس پر رویا یہاں تک کے نابینا ہو گیا؟ اور مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی نہیں تھا اور نہ ہی انبیاء کی خبر کو کوئی جانتا تھا۔ یہودی مدینہ سے متوجہ ہوئے اور آپ سے انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف یکبارگی نازل فرمادی، اس میں وہ سب کچھ ہے جو تورات میں تھا اور اس

سے کچھ زائد بھی، تو یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسی طرح نشانی تھی جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے لیے مردہ کو زندہ کرنا۔ اٰیٰتٌ سے مراد نصیحت ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد عبرت ہے۔ ایک روایت کے مطابق بعض مصاحف میں عبرۃ ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد بصیرت ہے۔ ایک قول کے مطابق: عجب۔ جس طرح کہا جاتا ہے۔ فلان آیت فی العلم والحسن یعنی فلاں آدمی علم وحسن میں عجب ہے۔ ثعلبی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: جب خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں تک پہنچا تو انہوں نے آپ کے ساتھ حسد کیا۔ ابن زید نے کہا: وہ انبیاء تھے اور انہوں نے کہا: کیا اسے یہ بات پسند ہے کہ اس کے بھائی اسے سجدہ کریں حتیٰ کے اسے اس کے والدین سجدہ کریں! تو انہوں نے عداوت کے سبب آپ سے بغاوت کر دی۔ اس قول کا رد پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اور ان کے اسماء: روبیل یہ ان میں سے سب سے بڑا تھا۔ شمعون، لاوی، یہوذا، زیالون، یشجر ان کی ماں لیابنت لیان تھی یہ حضرت یعقوب کی خالہ کی بیٹی تھی آپ کے چار بیٹے دو کنیزوں میں سے تھے۔ دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ پھر لیا فوت ہوگئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کی بہن راحیل سے شادی کر لی، تو آپ کے بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ سہیلی نے کہا: حضرت یعقوب کی ماں کا نام رفقا تھا اور راحیل بنیامین کے نفاس میں فوت ہوگئی اور لیان بن ناہر بن آزر حضرت یعقوب کی خالہ تھی۔ ایک قول یہ ہے: دونوں لونڈیوں کے نام لیا اور تلتا تھا۔ ان میں ایک راحیل اور دوسری اس کی بہن لیا تھی یہ دونوں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہبہ کی گئیں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کو اپنے پاس جمع کیا اور آپ کے بعد یہ کسی کے لیے بھی حلال نہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 23) کے سبب جو کچھ ابن زید نے کہا اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ، یوسف، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ لام تاکید کے لیے ہے۔ یہ وہ لام ہے جس کے ذریعے قسم اٹھائی جاتی ہے یعنی واللہ لیوسف، وَ اَخُوْهُ اس پر اس کا عطف ہے۔ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا اس کی خبر ہے اس کا تثنیہ آتا ہے اور نہ جمع کیونکہ یہ فعل کے معنی میں ہے۔ انہوں نے یہ صرف اس وجہ سے کہا کہ ان تک خواب کی خبر پہنچ گئی تو انہوں نے سازش شروع کی۔ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی جماعت اور وہ دس تھے۔ عصبہ ایک سے لے کر دس تک کے درمیان (بولا جاتا ہے) ایک قول ہے: پندرہ تک۔ ایک قول ہے: اس سے چالیس کے درمیان۔ اور لفظوں میں اس کا واحد نہیں جس طرح کہ نفر اور رھط (کا واحد نہیں ہوتا) اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ اس سے ان کی مراد دین کی گمراہی نہیں کیونکہ اگر وہ یہ مراد لیتے تو وہ کافر ہو جاتے، بلکہ ان کی مراد تدبیر کے رستے سے ہٹ جانا ہے اس طرح کہ اس پر دو کو ترجیح دے دی باوجود ان کے ساتھ نسبت کی برابری کے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف اور ان کے بھائی کو ہمارے اوپر ترجیح کے ذریعے واضح غلطی میں ہونے کی وجہ سے۔

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ کلام میں حذف ہے یعنی ان میں سے کہنے والے نے کہا: اقْتُلُوْا یُوْسُفَ یوسف کو قتل کر دو تا کہ یہ امر کے مادہ کو ہی ختم کرنے والا ہو جائے۔ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یعنی زمین میں فی حرف جر کو حذف کر کے اَرْضًا کو نصب دے دی گئی فی کے حذف کے حوالے سے سیبویہ نے شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے۔

لَدُنْ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُهُ فيه كما عَسَلَ الطَّرِيقَ الثَّعْلَبُ

مقام استشہاد عسل الطریق ہے جو کہ اصل میں عسل فی الطریق تھا۔

نحاس نے کہا: آیت کریمہ میں بہت سارے حسن ہیں کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ ان دو میں سے ایک حرف ہے پس جب حرف کو حذف کر دیا گیا تو فعل اس کی طرف متعدی ہو گیا۔ یہ (قتل اور پھینکنے کی) بات کہنے والے کے بارے میں ایک قول یہ ہے: وہ شمعون تھا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ کعب احبار نے کہا: دان۔ مقاتل نے کہا: روبیل۔ واللہ اعلم۔ اور اَرْضًا سے مراد ایسی زمین ہے جو ان کے باپ سے دور ہو۔ اس میں اضمار ضروری ہے کیونکہ وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) اپنے باپ کے پاس بھی تو زمین ہی میں تھے۔ يَخْلُ مجزوم ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے اس کا معنی ہے: خالص ہو جائے اور صاف ہو جائے لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ پس وہ مکمل طور پر تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور تم ہو جانا اس کے بعد یعنی گناہ کے بعد، ایک قول یہ ہے: یوسف کے بعد قَوْمًا صٰلِحِيْنَ یعنی توبہ کرنے والے لوگ یعنی اس عمل کے بعد توبہ کر لیتا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ کو قبول فرمائے گا۔ اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ قاتل کی توبہ بھی قابل قبول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے آنے والی اس بات کا انکار اور رد نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: صٰلِحِيْنَ سے مراد ہے یعنی بغیر کسی ترجیح اور فضیلت کے تمہارے معاملات تمہارے باپ کے نزدیک درست ہو جائیں گے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑩

"(یہ سن کر) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ نہ قتل کرو یوسف کو (بلکہ) پھینک دو اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اٹھا لیں گے اسے کوئی راہ چلتے مسافر اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے"۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ کہنے والا یہوذا ہے، یہ حضرت یعقوب کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ روبیل ہے(1) اور یہ آپ کی خالہ کا بیٹا ہے یہ وہی ہے جس نے فلن ابرح الارض کہا۔ ایک قول یہ ہے: وہ شمعون ہے۔ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ اہل مکہ، اہل بصرہ اور اہل کوفہ نے فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ پڑھا ہے جبکہ اہل مدینہ نے فی غیابات الجب پڑھا ہے ابو عبید کے نزدیک مختار واحد ہے کیونکہ اس سے مراد وہ ایک ہی مقام ہے جہاں انہوں نے آپ کو پھینکا تھا اس وجہ سے انہوں نے جمع کا انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ لغت میں تنگی لانے کے مترادف ہے۔ اس کو جمع یعنی غیابات پڑھنا دو اعتبار سے جائز ہے۔ سیبویہ نے سیر علیہ عشیانات و أصیلانات حکایت کیا ہے اور اس سے مراد عشیة و اصیلا ہے تو اس نے اس میں سے ہر وقت کو عشیة اور أصیلا بنا دیا ہے تو اسی طرح ہر وہ جگہ جہاں کوئی چیز چھپائی جائے وہ غیابة ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ گہرے کنوئیں میں کئی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ اور کہا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 184

جاتا ہے۔ غاب یَغِیبُ غَیْبًا وَغَیَابَةً جس طرح شاعر نے کہا ہے:

أَلَا فَالبِثَا شهرین أو نصفَ ثالثٍ الی ذَاکُمَا قدغَیَّبَتِی غِیَابِیَا

ہروی نے کہا: غیابة حوض یا کنوئیں کی وہ ایک طرف جس کو پانی کھا جاتا ہے یا پانی کے اوپر کنوئیں میں موجود طاق کے مشابہ ہے جو آنکھ سے کسی چیز کو چھپا لیتا ہے۔ ابن عزیر نے کہا: ہر وہ چیز جو آپ سے کسی چیز کو چھپا لے وہ غیابہ ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا: اسی سبب سے قبر کو غیابہ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فإن أنا یومًا غَیَّبَتنی غَیَابَتِی فَسِیروا بِسَیرِی فی العَشِیرةِ والأَهلِ

اس شعر میں غیابتی سے مراد میری قبر ہے۔

اور ''جب'' سے مراد وہ حوض ہے جسے پتھروں سے نہ بنایا گیا ہو اور اگر اسے پتھروں سے بنایا جائے تو وہی کنواں کہلائے گا اعشیٰ نے کہا:

لئن کنتَ فی جبٍّ ثمانین قامةً ورُقِّیتَ أسبابَ السَّماءِ بِسُلَّمِ

اس کو ''جب'' اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زمین میں ایک ٹکڑا کاٹا جاتا ہے اور ''جب'' کی جمع جببة وجباب واجباب آتی ہے۔ اس آیت میں غیابہ اور جب دونوں کو جمع کر دیا گیا کیونکہ اس سے کہنے والے کی مراد یہ تھی کہ اس کو کنوئیں کی کسی تاریک جگہ میں پھینکو تاکہ دیکھنے والے کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ ایک قول کے مطابق: یہ بیت المقدس کا کنواں ہے (1)، ایک قول یہ ہے: وہ اردن میں ہے یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ مقاتل کا قول ہے: یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مجاہد، ابورجاء، حسن اور قتادہ نے تلتقطه ''تا'' کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ اس معنی پر محمول ہوگا کہ بعض گزرنے والے سیارہ ہوتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: سقطت بعض أصابعه یعنی سقطت کو مؤنث استعمال کیا ہے۔ اس پر اس نے شعر پڑھا:

وتَشْرَقُ بالقولِ الذی قد أذعتَه کما شَرِقَتْ صَدْرُ القَنَاةِ من الدَّمِ

ایک اور شاعر نے کہا:

أرَی مَرَّ السِّنِینَ أَخَذْنَ مِنّی کما أَخَذَ السِّرَارُ من الهِلَالِ

شاعر نے شرق اور أخذت نہیں کہا۔ اور سیارہ سے مراد وہ جماعت ہے جو راستہ میں سفر کے لیے چلی ہے۔ کہنے والے نے یہ صرف اس وجہ سے کہا تاکہ انہیں آپ کو دور کسی جگہ لے جانے کی ضرورت بھی نہ پڑے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ پس گزرنے والوں میں سے جو آپ کو اٹھائے گا وہ آپ کو دور دراز مقام پر لے جائے گا تو گویا یہ ان کی تدبیر کی صورت تھی تاکہ ان کو بذات خود کوئی حرکت نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ ان کے والد ان کو اجازت نہ دیتے اور یہ بھی ہو سکتا تھا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 185

کہ وہ ان کے ارادے سے آگاہ ہو جاتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نہ اس واقعہ سے پہلے نبی تھے اور نہ ہی بعد میں کیونکہ انبیاء کسی مسلمان کے قتل کا منصوبہ نہیں بناتے البتہ وہ مسلمان تھے۔ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا پھر توبہ کر لی۔ ایک قول یہ ہے: وہ انبیاء تھے، عقلا نبی کی لغزش محال نہیں تو یہ ان کی لغزش تھی، ان کا یہ فعل اس عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ انبیاء گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس وقت وہ نبی نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے آگاہ فرمایا اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا گیا تو اس وقت وہ بچے تھے۔ اسی طرح ابن قاسم نے بھی آپ سے روایت کیا ہے، یعنی اس وقت آپ چھوٹے تھے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ ہے آپ نے کہا کہ اٹھایا تو چھوٹے کو ہی جا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ یہ چیز بھی بچوں کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ التقاط راستے سے کسی چیز کو اٹھانا ہے اسی طرح سے اللقیط اور اللقطہ ہے، ہم (قرطبی) ان کے وہ احکامات جن پر آیت اور حدیث دلالت کرتی ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ اہل علم اور اہل لغت نے کہا ہے ذکر کرتے ہیں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: التقاط سے مراد بغیر طلب کے کسی چیز کا پا لینا ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ ہے یعنی وہ ان کو پالیں گے بغیر اس کے کہ وہ گزرنے والی جماعت آپ کی تلاش میں ہو۔ علما کا لقیط کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: اس کی اصل آزادی ہے کیونکہ آزاد، غلاموں پر غالب ہیں۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے لقیط کے آزاد ہونے کا فیصلہ دیا، اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (یوسف: 20) کی تلاوت فرمائی اسی جانب اشہب گئے ہیں جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی ہیں اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک پوری جماعت سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے اس کی غلامی کی نیت کی تو وہ مملوک ہوگا۔ اور اگر اس نے اجر و ثواب کی نیت کی تو وہ آزاد ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے موطا میں لکھا ہے: ہمارے نزدیک لقیط کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آزاد ہے اور اس کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی، وہی اس کے وارث ہوں گے اور وہی اس کے عاقلہ بھی ہیں۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: وانما الولاء لمن أعتق (1)، ولاء صرف اسی کی ہے جس نے آزاد کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معتق سے ولاء کی نفی کر دی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان دونوں کے اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ لقیط کسی کا وارث نہیں بنے گا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اصحاب اور اکثر کوفیوں کا قول ہے: جو چاہے لقیط کا والی بن سکتا

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفرائض، جلد 2، صفحہ 34

ہے اور جو اس کا والی بنے گا وہی اس کا وارث ہوگا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا؛ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی ولاء کے ساتھ جہاں چاہے منتقل ہو سکتا ہے جب تک کہ جو اس کا والی بنا اس نے اس کی طرف سے دیت ادا نہ کی ہو اور اگر اس نے اس کی طرف سے دیت ادا کی ہے تو یہ کبھی بھی اپنی ولاء کے ساتھ منتقل نہیں ہو سکتا۔ ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے: لقیط آزاد ہے۔ اگر وہ اس کا والی بننا چاہے جس نے اس کو اٹھایا تو وہ اس کا ولی بن جائے اور اگر وہ اس کے علاوہ اس کا والی بننا پسند کرتا ہے تو کسی اور کا والی بن جائے، اسی قسم کی بات حضرت عطا سے منقول ہے یہی ابن اشہاب رحمۃ اللہ علیہ اور اہل مدینہ کے ایک گروہ کا قول ہے، کہ لقیط آزاد ہے۔ ابن عربی نے کہا(1) کہ لقیط کی اصل آزادی ہے غلام پر آزاد لوگوں کے غلبہ کی وجہ سے، لہٰذا غالب اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا جس طرح کہ غلبہ ظن کی بنیاد پر اس کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، پس اگر وہ ایسے گاؤں میں تھا جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہیں تو ابن قاسم نے کہا: جو زیادہ اکثریت میں ہے اس پر اس کا حکم لگایا جائے گا، اگر اس پر یہودیوں کا لباس ہے تو وہ یہودی ہے۔ اگر اس کا لباس نصاریٰ والا ہے تو یہ نصرانی ہے۔ ورنہ وہ مسلمان ہوگا مگر یہ کہ اکثر گاؤں والے اگر اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر ہوں (تو پھر اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا) کسی اور آدمی کا قول ہے، اگر اس گاؤں میں ایک بھی مسلمان ہو تو لقیط کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اسلام کے اس حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کہ وہ غالب ہوتا ہے اور اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ اشہب کے قول کا مقتضی بھی یہی ہے: وہ ہمیشہ مسلمان ہوگا کیونکہ میں اس کو ہر حال میں مسلمان ہی بناتا ہوں جس طرح کہ میں اس کو ہر حال میں آزاد بناتا ہوں۔ فقہاء کا ایسے لقیط کے بارے میں اختلاف ہے بینہ جس کی غلامی پر دلالت کرے۔ اہل مدینہ کے گروہ نے کہا ہے: اس سلسلہ میں بینہ کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی جانب اشہب بھی گئے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی وجہ سے: وہ آزاد ہے، اور جس کی آزادی کا فیصلہ کر دیا گیا اس کی غلامی کی بینہ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ابن قاسم نے کہا: اس معاملہ میں بینہ کو قبول کیا جائے گا، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کوفی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لقیط کے بارے میں کہا: اگر ملتقط نے لقیط پر کچھ خرچ کیا ہو پھر کسی آدمی نے لقیط کے بارے میں بینہ پیش کر دی کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو اگر لقیط کے باپ نے جان بوجھ کر اس کو پھینکا تھا تو ملتقط باپ کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور اگر پھینکنا نہ پایا جائے بلکہ وہ اس سے گم ہو گیا ہو تو پھر باپ پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ملتقط نفقہ کے سلسلہ میں متطوع شمار کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر اس نے لقیط پر کچھ خرچ کیا تو وہ متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا مگر یہ کہ حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہو۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر وہ آدمی جس نے کسی ایسے آدمی پر خرچ کیا جس پر خرچ کرنا اس پر لازم نہ تھا تو یہ اس پر خرچ کردہ رقم کے ساتھ رجوع کر سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر لقیط کا مال نہ ہو تو اس کا نفقہ بیت المال پر ہوگا مال نہ ہونے کی صورت میں دو قول ہیں: ایک قول اس کے اپنے ذمہ میں اس کے لیے قرض لیا جائے گا اور دوسرا قول...... بغیر کسی عوض کے مسلمانوں پر قسط باندھی جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

مسئلہ نمبر 7۔ لقطہ اور ضوال (گمشدہ چیز) کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: لقطہ اور ضوال دونوں معنی میں برابر ہیں اور ان دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے یہ موقف امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، انہوں نے ابوعبید قاسم کے اس کا قول کا انکار کیا ہے کہ گمشدگی صرف حیوان میں ہوتی ہے جبکہ لقطہ حیوان کے علاوہ دیگر چیزوں میں ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ قول غلط ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان أمکم ضلت قلادتها کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ تمہاری ماں سے اس کا قلادہ گم ہوگیا۔ اس میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلادہ پر مطلقاً ضالہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ لقطہ کے بارے میں علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر وہ بالکل کوئی معمولی چیز ہو یا ایسی چیز ہو جو باقی نہیں رہ سکتی تو پھر پورا سال اس کا اعلان کیا جائے گا۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر اس چیز کا مالک آ گیا تو وہ ملتقط کی نسبت اس کا زیادہ حق دار ہوگا بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہی اس کا مالک ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر سال گزرنے کے بعد ملتقط اس چیز کو کھا گیا اور مالک اس کو اس کا ضامن بنانا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اگر ملتقط نے اسے صدقہ کر دیا ہو تو پھر مالک کو ضامن بنانے اور اس کا اجر وثواب حاصل کرنے دونوں کا اختیار ہے ان دونوں میں سے جس کو مالک اختیار کرے اس کے لیے بالاجماع ایسا کرنا درست ہوگا۔ صدقہ کرنے کے سبب لقطہ میں ملتقط کا قبضہ نہیں چلے گا اور نہ ہی وہ سال سے قبل تصرف کر سکتا ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ گمشدہ ریوڑ میں سے جس کا ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس کا کھانا ملتقط کے لیے جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ فقہاء کا لقطہ کو اٹھالینے یا چھوڑ دینے کی افضلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں حدیث طیبہ میں لقطہ کو اٹھانے اور گمشدہ چیز کو لینے کے مباح ہونے پر دلیل ہے بشرطیکہ وہ اونٹ نہ ہو۔ بکری کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''تمہارے لیے یا تمہارے بھائی کے لیے یا بھیڑیے کے لیے'' (1)۔ اس میں آپ نے لقطہ کو اٹھانے پر ابھارا ہے اور کسی چیز کے بارے میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ ضائع ہو جائے یا اس کا مالک آ جائے۔ اگر لقطہ کو چھوڑ دینا افضل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم ارشاد فرماتے جس طرح آپ نے اونٹ کی گمشدگی کے بارے میں فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے مذہب میں اس معاملہ میں گنجائش ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کو اٹھا لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، یہ اسماعیل بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے کہا: میں کسی کے لیے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ لقطہ کو پانے کی صورت میں اس کو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ اس پر امین ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لقطہ کا تھوڑا ہونا یا اس کا زیادہ ہونا (اس سلسلہ میں) برابر ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ نے حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، انہوں نے کہا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ سے لقطہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''لقطہ کی تھیلی اور رسی کے بارے میں پہچان کر دا پھر سال بھر اس کا اعلان کر اگر اس کا مالک آ جائے تو صحیح ورنہ اس کے بارے میں تمہارا فیصلہ'' (2) (صحیح ہوگا) پوچھنے والے نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گمشدہ بکری؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے، تیرے بھائی کے لیے یا

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالة الغنم، جلد 1، صفحہ 328
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 78

بھیڑیئے کے لیے'' (1)۔ اس نے کہا: گمشدہ اونٹ؟ آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے نہیں اور اس کے لیے ہے جس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور اس کے جوتے ہوں وہ پانی پر چلا جائے گا اور درخت کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا'' (2)۔ اور حضرت ابی بن کعب کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تو اس کی تعداد، برتن اور رسی کی حفاظت کر اگر اس کا مالک آجائے تو صحیح ورنہ اس سے نفع حاصل کر'' (3)۔ اس حدیث طیبہ میں تعداد کا لفظ زیادہ ہے۔ اس کو مسلم وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ لقطہ کی تھیلی اور رسی اس کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ اور اس پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ جب لقطہ کا مالک اس کے تمام اوصاف کو بیان کر دے گا تو لقطہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا؟ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کو دینے پر اٹھانے والے کو مجبور کیا جائے گا؛ اور اگر کوئی ایسا مستحق آگیا جو بینہ یعنی گواہی کی وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرا ہے تو ملتقط کسی چیز کا ضامن نہیں ہوگا۔ اور کیا وہ آدمی اوصاف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قسم اٹھائے گا یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں پہلا قول اشہب کا ہے اور دوسرا ابن قاسم کا۔ امام مالک آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کے نزدیک بینہ اسے لازم نہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی نے فرمایا: یہ اس کے سپرد تب تک نہیں کیا جائے گا جب تک وہ اس بات پر بینہ پیش نہیں کرتا کہ یہ اسی کی ہے۔ اور یہ حدیث کی نص کے خلاف ہے، کیونکہ اگر حوالے کرنے میں بینہ شرط ہو تو پھر تھیلی، رسی اور عدد کے ذکر کا کوئی معنی نہیں، پس وہ بینہ کے ذریعے تو ہر حال میں اس کا مستحق ہو جائے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے خاموشی اختیار فرمانا درست نہیں، لہٰذا یہ ضرورت کے وقت سے بیان کی تاخیر ہوگی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ حدیث طیبہ اونٹ اور ریوڑ پر نص ہے اور حدیث نے ان دونوں کے حکم کو بیان کر دیا ہے اور ان کے علاوہ جتنے حیوان ہیں ان کے بارے میں حدیث میں سکوت ہے۔ ہمارے (قرطبی) علماء میں گائے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا یہ اونٹ کے ساتھ ملحق ہوگی یا ریوڑ کیساتھ؟ اسی طرح گھوڑے خچر اور گدھے کے التقاط کے بارے میں بھی ہمارے ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اور اشہب اور ابن کنانہ نے کہا ہے: نہیں اٹھایا جائے گا۔ ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ صحیح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے: ''اپنے مومن بھائی کی گمشدہ چیز کی حفاظت کرو''۔

مسئلہ نمبر 12۔ علماء کا ضوال (گمشدہ چیز) پر خرچ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے کہا: اگر ملتقط نے چوپائیوں اور اونٹ وغیرہ پر خرچ کیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ لقطہ کے مالک پر نفقہ کیساتھ رجوع کرے خواہ اس نے اس پر حاکم کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا یا اس کی اجازت کے بغیر آپ نے فرمایا: ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جو کچھ اس نے خرچ کیا اس نفقہ کے بدلے میں اس کو اپنے پاس روک کے رکھے اور یہ اس کا زیادہ حق دار ہے جس طرح کہ رہن ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جب گمشدہ چیز کو لینے والے نے اس پر خرچ کیا تو وہ

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالۃ الغنم، جلد 1، صفحہ 328
2۔ ایضاً، ضالۃ الابل، جلد 1، صفحہ 327
3۔ ایضاً، اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 327

متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا ربیع نے یہ مسئلہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کیا ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے کہا ہے: جب حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا تو وہ دین ہوگا۔ اور جتنے کا اس نے دعویٰ کیا اس کی طرف سے قبول کیا جائے گا بشرطیکہ اتنا خرچ ہو جاتا ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب اس نے لقطہ اور اونٹ پر قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ کیا تو متطوع ہوگا اور اگر قاضی کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا تو یہ لقطہ کے مالک پر دین ہوگا جب بھی وہ آیا اور ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جب اس کا مالک آئے تو اس کو اپنے پاس روک لے اور تین دن یا اس کے لگ بھگ وہ اس پر خرچ کرے یہاں تک کہ قاضی بکری یا اس کی مثل چیز کو بیچنے کا حکم دے اور اس کے نفقہ کا فیصلہ کر دے۔

مسئلہ نمبر 13۔ لقطہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں تعریف کے بعد ایسے الفاظ نہیں ہیں جو تملیک پر اور لقطہ کے مالک کے آنے کے بعد ملتقط سے ضمان کے ساقط ہونے پر دلالت کریں مثلاً: واستمتع بھا تم اس سے لطف حاصل کرو (1) فشانك بھا پس اس کے ساتھ تمہارا معاملہ (2) فھی لك پس وہ تمہارے لیے ہے (3)۔ فاستنفقھا پس تم اسے خرچ کرو (4)۔ ثم كلھا پھر تم اسے کھاؤ (5)، فھو مال اللہ یؤتیہ من یشاء پس وہ اللہ کا مال ہے وہ جس کو چاہے دے دے (6)۔ جس طرح کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے: ''پس اگر تو اس کا اعلان نہ کرے تو اس کو خرچ کر لے اور وہ تیرے پاس ودیعت بن جائے گی اور اگر زمانہ میں کبھی بھی اس کا مالک آ گیا تو وہ اس کو ادا کرے''۔ ایک روایت میں ہے: ''پھر تو اس کو کھا لے اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کو وہ ادا کرے'' (7)۔ اس کو امام مالک، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب بھی اس کا مالک آ گیا وہ اس کا زیادہ حق دار ہوگا سوائے داؤد ظاہری کے ان کا موقف یہ ہے کہ ملتقط تعریف کے بعد لقطہ کا مالک بن جائے گا ان ظواہر کی بنیاد پر، مگر ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی ایک تو اس وجہ سے کہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فاذھا الیہ کی وجہ سے کہ ''تو اس کو وہ ادا کر دے''۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

''(یہ طے کرنے کے بعد) انہوں نے (آکر) کہا: اے ہمارے باپ! کیا ہوا آپ کو کہ آپ اعتبار ہی نہیں کرتے ہم پر یوسف کے بارے میں حالانکہ ہم تو اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ آپ بھیجئے اسے ہمارے ساتھ کل تاکہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور (کوئی فکر نہ کیجئے) ہم اس کے نگہبان ہیں''۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا مومن حسد کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تجھے بنی یعقوب کا معاملہ کیوں بھول گیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: باپ بہت زیادہ چلانے والا ہے اور بھائی بہت زیادہ چھیننے

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطۃ، جلد 2، صفحہ 79 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 79 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً، کتاب اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 329

والا ہے۔ اس وقت وہ ایک حیلہ کے ذریعے باپ، بیٹے کو جدا کرنے پر جمع ہوئے اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے باہم بات چیت کی اور متکلم ثانی کی رائے پر جدا جدا ہوئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس واپس لوٹ کے گئے اور یہ بات کہی، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے ساتھ نکلنے کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا مگر آپ نے انکار فرمایا جس طرح کہ آئے گا۔ یزید بن قعقاع، عمرو بن عبید اور زہری نے لَا تَاْمَنَّا کو ادغام اور بغیر اشمام کے پڑھا ہے اور یہی قیاس ہے کیونکہ ادغام کا طریقہ یہ ہے کہ جس کا ادغام کیا جائے وہ ساکن ہو۔ طلحہ بن معرف نے لَا تَاْمَنَنَا اصل پر رکھتے ہوئے دونوں نونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور ابورزین نے لاتیمنّا تا کے کسرہ کے پڑھا ہے یہ لغت تمیم ہے اور اعمش سے روایت ہے وہ کہتے ہیں أنت تضرب یہ پہلے گزر چکا ہے، تمام لوگوں نے اسے ادغام اور اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، تاکہ یہ ادغام سے پہلے حرف کی حالت پر دلالت کرے۔ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ یعنی ہم اس کی حفاظت میں (مخلص ہیں) حتی کہ ہم اسے آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔ مقاتل نے کہا: کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کو کہا: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا الایہ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجئے، تو اس وقت ان کے باپ نے کہا: اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ تو اس وقت انہوں نے ان کی بات کے جواب میں کہا: مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ الایہ۔ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یعنی اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجئے صحراء کی طرف، يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ، غدا ظرف ہے سیبویہ کے نزدیک اصل غدو ہے بعض اوقات اس کو اصل کے مطابق بھی بولا جاتا ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: فجر اور صبح کی نماز کے درمیان کے وقت کو غدوہ کہا جاتا ہے اسی طرح اس وقت کو بکرہ بھی کہا جاتا ہے۔ نرتع ونلعب نون اور عین کے سکون کے ساتھ اہل بصرہ کی قرأت ہے۔ اہل مکہ کی قرأت میں سے معروف نرتع نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اہل کوفہ کی قرأت یرتع ویلعب یا اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اور اہل مدینہ کی قرأت یا اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بہتر قرأت عربوں کے قول رتع الانسان والبعیر کے مطابق ہے۔ (یہ اس وقت بولتے ہیں) جب انسان اور اونٹ جس طرح چاہیں کھائیں۔ اور معنی یہ ہوتا ہے: ہم شادابی میں وسیع ہیں؛ اور ہر شاداب وادی خوشگوار ہے۔

شاعر نے کہا: فارعی فزارۃُ لاھناكِ المَرْتَعُ۔ المرتع معنی چراہ گاہ ہے

ایک اور شاعر نے کہا:

تَرْتَعُ ما غَفَلَتْ حتی إذا ادكرتْ فإنّما هي إقبالٌ وادبارُ

یہاں بھی ترتع اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

أكفراً بعد رَدِّ الموت عَنِّي وبعد عطائِكَ المائةَ الرِّتَاعا (1)

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 187

الرتاعا کا بیان بھی اسی معنی کو بیان کر رہا ہے، یعنی الرتاعا سے مراد الراتعة ہے۔
معمر نے قتادہ سے ترتع روایت کیا ہے یعنی تسعی۔ نحاس نے کہا: انہوں نے انا ذھبنا نستبق سے اسے اخذ کیا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے: ہم دوڑ میں اس کی معینہ انتہا میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح عین کے سکون کے ساتھ یرتع بھی ہے، البتہ یہ اکیلا حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ہے اور یَّرْتَعْ عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ ہے جس نے ریوڑ کو چرایا یعنی یہ اس بات کی مشق اور تجربہ بھی کریں پس کبھی جی بھر کر کھائیں گے اور کبھی بچپن کی وجہ سے کھیلیں گے۔ قتبی نے کہا: یَّرْتَعْ یعنی ہم چوکیداری کریں گے اور حفاظت کریں گے اور ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے۔ اس صورت میں یہ آپ کے قول: دعاك الله سے ہوگا جس کا معنی ہے الله تیری حفاظت کرے۔ اور نلعب لعب سے ہوگا۔ ابو عمرو بن علا کو کہا گیا: انہوں نے نلعب کیسے کہا حالانکہ وہ انبیاء ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: اس وقت وہ انبیاء نہیں تھے۔ ایک قول یہ ہے: لعب سے مراد خوشی و مسرت میں سے جو مباح ہے وہ ہوگا نہ کہ وہ ممنوع کھیل مراد ہے جو حق و سچ کی ضد ہے، اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے نلعب کے قول کو رد نہیں فرمایا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فهلا بكرا تلاعبها و تلاعبك ہے (1) پس کیوں نہ باکرہ عورت کے ساتھ تو نے شادی کی تو اس کے ساتھ ملاعبت کرتا اور وہ تیرے ساتھ ملاعبت کرتی (اس حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعب کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں) مجاہد اور قتادہ نے یَّرْتَعْ بمعنی یرتع مطیۃ پڑھا ہے۔ مفعول کو حذف کر دیا گیا وَ يَلْعَبْ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور معنی ہوگا: وہ اس میں سے تھا جو کھیلتا ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہر اس چیز سے جس کا آپ کو اس پر خوف ہے۔ پھر یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سوار ہو کر نکلے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیدل تھے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تک اپنے کندھوں پہ اٹھائے رکھا جب تک حضرت یعقوب علیہ السلام ان کو دیکھ رہے تھے پھر جب وہ آپ کی آنکھوں سے غائب ہوئے تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تکلیف دینے کے لیے اتار دیا تا کہ آپ ان کے ساتھ دوڑیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"آپ نے فرمایا: بے شک مجھے غمزدہ بناتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کھا نہ جائے اس کو بھیڑیا اور تم (سیر و تفریح کے باعث) اس سے بے خبر ہو۔ کہنے لگے: اگر کھا جائے اسے بھیڑیا حالانکہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں بلاشبہ ہم تو بڑے زیاں کار ہوئے"۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ محل رفع میں ہے یعنی تمہارا اس کے ساتھ جانا، آپ نے اپنی عدم موجودگی کے سبب اپنی پریشانی سے باخبر کیا۔ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام پر حملہ آور ہوا تو آپ کو یہ خوف لاحق ہوا یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے خواب دیکھا کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، شراء الدواب والحمیر، جلد 1، صفحہ 282

پہاڑ کی چوٹی پر ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام بطن وادی میں۔ اتنے میں دس بھیڑیوں نے آپ کو وحشت میں مبتلا کر دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو کھانا چاہتے تھے تو ایک آدمی نے آپ سے ان کو زور سے دھکیلا پھر زمین پھٹ گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک اس میں چھپ گئے پس وہ دس آپ کے بھائی تھے جب وہ آپ کے قتل کی طرف مائل ہوئے تو جس نے آپ سے ان کو ہٹایا وہ آپ کا بڑا بھائی یہوذا تھا اور زمین میں آپ کا چھپنا وہ تین دن آپ کا کنوئیں میں قیام تھا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ نے صرف اس لیے کہا کہ آپ کو ان کی طرف سے حضرت یوسف پر خوف تھا اور آپ نے بھیڑیے کے ذریعے وہ مراد لیے پس آپ کا خوف ان کی طرف سے آپ کا قتل تھا تو آپ نے ان کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے بھیڑیے کے ذریعے کنایۃً ان سے بات کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے ان کو بھیڑیا کہا۔ ایک قول یہ ہے: آپ علیہ السلام کو ان کی طرف سے کوئی خوف نہ تھا ورنہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے اور آپ نے بھیڑیے سے صرف اس لیے ڈرایا کہ صحراؤں میں اکثر ان سے خوف رہتا ہے۔ الذِّئْبُ، تذابت الریح سے مشتق ہے جب وہ من کل وجہ آ جائے اسی طرح احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: الذئب مہموز ہے کیونکہ یہ من کل وجہ آتا ہے۔ ورش نے نافع سے الذیب بغیر ہمزہ کے روایت کیا ہے۔ جب ہمزہ ساکن ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو تو وہ مخفف ہو کر یا بن جاتا ہے۔ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ یعنی تم کھانے پینے میں مشغول رہو گے۔

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی ایسی جماعت جو بھیڑیئے کو دیکھے گی اور اسے آپ سے دور نہ ہٹائے گی۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ اپنے ریوڑ کی حفاظت کے سلسلہ میں یعنی جب ہم اپنے بھائی سے بھیڑیئے کو نہیں ہٹا سکیں گے تو اپنے ریوڑ سے اس کو دور کرنے میں تو اس سے بھی زیادہ عاجز ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے: لَّخٰسِرُوْنَ سے مراد ہے کہ اپنے حق سے ناواقف ہوں گے، جب کہ ایک قول یہ ہے: عاجز ہوں گے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝

"پھر جب (بڑے اصرار سے) اسے لے گئے اور سب نے یہی طے کر لیا کہ ڈال دیں اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اور (عین اس وقت) ہم نے اس کی طرف وحی کی (گھبراؤ نہیں) تم ضرور انہیں آگاہ کرو گے ان کے اس فعل پر اور وہ (تیرے رتبہ عالی کو) نہیں سمجھتے"۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ، ان محل نصب میں ہے یعنی علی أن یجعلوہ فی غیابۃ الجب اس قصہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب نے جب آپ کو ان کے ساتھ بھیجا تو ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ ضرور اس کی حفاظت کریں گے اور آپ کو روبیل کے سپرد کیا اور فرمایا: اے روبیل! یہ چھوٹا ہے اور اے میرے بیٹے تو اس پر میری شفقت کو جانتا ہے اگر اسے بھوک لگے تو اس کو کھانا کھلانا اور اگر پیاس لگے تو پانی پلانا یہ اگر تھک جائے تو اٹھا لینا پھر اس کو میرے پاس واپس لانے میں جلدی کرنا۔ انہوں نے آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا شروع کیا ایک نہ اتارتا تھا کہ دوسرا اٹھا لیتا اور حضرت یعقوب علیہ

السلام کئی میل ان کے پیچھے چلے پھر واپس لوٹ گئے جب وہ اپنے باپ کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو جس نے آپ کو اٹھا یا ہوا تھا اس نے آپ کو زمین پر دے مارا حتیٰ کہ ہڈیاں ٹوٹنے کے قریب ہو گئیں تو آپ نے دوسرے کے پاس پناہ لی مگر ہر ایک کی طرف سے دوسرے سے زیادہ غصہ اور تکلیف ملی تو آپ نے روبیل سے مدد طلب کی اور کہا: تو میرا بڑا بھائی ہے میرے والد کے بعد میرا نگران ہے میرے بھائیوں میں میرے سب سے زیادہ قریب ہے۔ مجھ پر اور میری کمزوری پر رحم کر۔ تو اس نے آپ کو بہت سخت تھپڑ مارا اور کہا: میرے اور تیرے درمیان کوئی قرابت نہیں ان گیارہ ستاروں کو بلا جو تجھے ہم سے بچائیں تو آپ کو پتا چل گیا کہ ان کا حسد خواب کی وجہ سے ہے تو آپ اپنے بھائی یہوذا کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا: اے میرے بھائی! میری کمزوری، عاجزی اور کمسنی پر رحم کر اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کے دل پر رحم کھا، کتنی جلدی تم اس کی وصیت کو بھول گئے اور اس کے عہد کو تم نے توڑ دیا، تو یہوذا کا دل نرم ہوا اور اس نے کہا: اللہ کی قسم جب تک میں زندہ ہوں یہ تمہارے کبھی بھی قریب نہ آسکیں گے تو اس نے کہا: اے میرے بھائیو! جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہو اس کا قتل بہت بڑی غلطی ہے پس اس بچے کو اس کے باپ کے پاس واپس چھوڑ آؤ اور ہم اس کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کو اس واقعہ میں سے کچھ بھی نہیں بتائے گا، تو اس کے بھائی نے کہا: اللہ کی قسم تو فقط یعقوب علیہ السلام کے نزدیک اپنا مقام بنانا چاہتا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو ہم اس کے ساتھ تجھے بھی قتل کر دیں گے، تو اس نے کہا: اگر تمہیں یہ بات پسند نہیں تو لو یہ تاریک اور خوفناک کنواں ہے جو سانپوں اور کیڑے مکوڑوں کی پناہ گاہ ہے۔ اسے اس میں پھینک دو اگر اسے ان میں سے کسی چیز نے آلیا تو یہی اس کی مراد ہو گی اور تم اس کے خون سے محفوظ رہو گے اور اگر یہ گزرنے والی کسی جماعت کے ہاتھ لگ گیا تو وہی اس کی قسمت ہو گی تو یہ معاملہ ان کے نزدیک طے ہو گیا یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ، لما کا جواب محذوف ہے یعنی فلما ذھبوا بہ واجمعوا علی طرحہ فی الجب عظمت فتنتھم۔ ایک قول یہ ہے: لما کا جواب ان کا یہ قول ہے: قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ۔ ایک قول کے مطابق: تقدیر عبارت یوں ہے فلما ذھبوا بہ من عند ابیھم واجمعوا ان غیابۃ الجب جعلوہ فیھا یہ بصریوں کے مذہب کے مطابق ہے۔ جہاں تک کوفیوں کا قول ہے تو ان کے نزدیک اس کا جواب اَوْحَیْنَاۤ ہے واو مقحمہ ہے ان کے نزدیک ''واو'' لما اور حتی کے ساتھ زائدہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی (اصل میں) فتحت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (ہود: 40) یعنی فار۔ امری القیس نے کہا:

فلما أجزنا ساحة الحيّ وانتحی

یہاں بھی واؤ زائدہ ہے یعنی اصل میں صرف انتحی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ۝ (الصافات) ہے وَ نَادَیْنٰهُ (مریم: 52) یعنی نَادَیْنٰهُ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ میں اس وقت میں آپ کی نبوت پر دلیل ہے حضرت حسن، مجاہد، ضحاک اور حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حال میں نبوت عطا فرمائی کہ آپ تاریک کنویں میں پانی کے اوپر اٹھے ہوئے پتھر پر تھے۔ کلبی نے کہا: جس وقت آپ کو کنویں میں پھینکا گیا اس وقت

آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی، اور آپ چھوٹے نہ تھے اور جس نے کہا ہے کہ آپ چھوٹے تھے تو عقلاً یہ بات بھی بعید نہیں کہ چھوٹے بچے کو بھی خبر دے دی جائے اور اس کی طرف وحی کر دی جائے۔ ایک قول یہ ہے: وحی دراصل الہام تھا۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل: 68) تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف الہام کیا۔ ایک قول یہ ہے: آپ خواب میں تھے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ جبرائیل امین آپ کے پاس وحی لے کر آئے۔

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ عنقریب انہیں اپنے کیے کی سزا مل جائے گی اس صورت میں وحی آپ کے دل کی تقویت اور سلامتی کی خوشخبری کے طور پر آپ کے کنویں میں پھینکے جانے کے بعد ہوئی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ وحی فرمائی جو آپ کے بھائی آپ کے ساتھ کرنے والے تھے اس صورت میں وحی آپ کے کنوئے میں پھینکے جانے سے پہلے آپ کو بروقت خبردار کرنے کے لیے ہوئی۔ **وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ** اور وہ یہ شعور نہیں رکھتے کہ آپ یوسف ہیں۔ اور یہ اس وقت ہے جب مصر میں حکومت آپ کے سپرد کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنے باپ اور بھائیوں کو اپنے مکان کے بارے میں آگاہ نہ کریں، ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کے بارے میں جو وحی فرمائی (اس کا شعور نہیں) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے اور ایک قول یہ ہے ''ھا'' حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں بذریعہ وحی اس سے آگاہ فرما دیا کہ جو کچھ انہوں (آپ کے بھائیوں) نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا، اور عنقریب اللہ کے حکم سے آپ انہیں اس کے بارے میں بتائیں گے اور وہ (بھائی) اس بات کا شعور نہیں رکھتے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی۔ واللہ اعلم، حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کردہ قصہ جس کو سدی اور دیگر لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ جب آپ کو گہرے کنوئیں میں پھینکا گیا۔ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا تو آپ کنوئیں کی منڈیر کے ساتھ لٹک گئے تو انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیے اور آپ کی قمیص اتار دی۔ تو آپ نے کہا: اے میرے بھائیو! مجھے میری قمیص واپس کر دو تا کہ اس کنوئیں میں اس کے ذریعے چھپ جاؤں پس اگر میں مر گیا تو وہ میرا کفن ہوگی اور اگر میں زندہ رہا تو اس کے ذریعے میں اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لوں گا۔ تو انہوں نے کہا: سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو بلاؤ وہ تمہارے سر کو ڈھانپیں اور تجھے کپڑے پہنائیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا، پس انہوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا یہاں تک کہ جب آپ اس کے نصف تک پہنچ گئے تو انہوں نے آپ کو اس ارادے کے ساتھ پھینک دیا کہ آپ گریں گے اور مر جائیں گے۔ کنوئیں میں پانی تھا، آپ اس میں گرے پھر آپ نے ایک چٹان کی پناہ لی اور اس پر کھڑے ہو گئے۔ ایک قول یہ ہے: شمعون نے اس کو یہ چاہتے ہوئے کاٹا کہ وہ آپ کو چٹان پر ٹکڑے ٹکڑے کر دے، جبکہ جبرئیل امین ساق عرش کے نیچے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ میرے بندے تک پہنچ۔ جبرئیل نے فرمایا: میں نے بہت زیادہ تیزی کی اور زمین پر اترا یہاں تک کہ میں رسی اور وقوع کے درمیان حائل ہو گیا اور میں نے آپ کو صحیح سلامت چٹان پر بٹھا دیا وہ کنواں شیروں کی پناہ گاہ تھا، آپ چٹان پر کھڑے ہوئے اور رونے لگے تو انہوں نے آپ کو آواز دی آپ نے اس آواز کو اپنے اوپر ایسی رحمت سمجھا جس نے انہیں (بھائیوں کو) پکڑ لیا

ہے۔ تو آپ نے انہیں جواب دیا۔ انہوں نے آپ کو چٹان سے گرانا چاہا مگر یہوذا نے انہیں روکا، یہوذا آپ کے پاس کھانا لایا کرتا تھا، جب آپ ننگے ہو گئے تو جبرئیل آپ کے پاس پہنچا اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ننگا آگ میں ڈالا گیا تو جبرائیل ریشم کی ایک قمیص لے کر آئے اور اس نے آپ کو پہنا دی وہ حضرت براہیم علیہ السلام کے پاس تھی پھر حضرت اسحاق علیہ السلام اس کے وارث بنے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام وارث بنے جب حضرت یوسف علیہ السلام بڑے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو ایک تعویز میں ڈال کر آپ کے گلے میں ڈال دیا حضرت یوسف علیہ السلام اس کو علیحدہ نہیں کرتے تھے، جب آپ کو ننگا کنوئیں میں ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام نے وہ قمیص نکال کر آپ کو پہنا دی۔ وہب نے کہا: جب آپ چٹان پر کھڑے ہوئے تو آپ نے کہا: اے بھائیو! ہر میت کی کوئی نہ کوئی وصیت ہوتی ہے۔ میری وصیت کو سنو، انہوں نے کہا: وہ کیا ہے؟ آپ نے کہا: جب تم سارے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے مانوس ہو رہے ہو گے تو میری غربت کو یاد کرنا اور جب تم کسی نوجوان کو دیکھو گے تو میری جوانی کو یاد کرنا، جبریل نے کہا: اے یوسف! اس (وصیت) کو چھوڑو اور دعا میں مشغول ہو جاو، دعا کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام ہے پھر جبریل علیہ السلام نے آپ کو دعا بتائی تو آپ نے عرض کیا: اے اللہ! اے ہر اجنبی کے مونس! اے ہر تنہا کے ساتھی! اے ہر خوف زدہ کے ملجا! اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے! اے ہر سرگوشی کو جاننے والے! اے ہر شکوہ کی انتہا اور اے ہر اجتماع کے حاضر! اے زندہ! اے زندہ رکھنے والے! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میرے نزدیک تیرے سوا نہ کوئی غم اور نہ کوئی مصروفیت رہے، اور میرے لیے میرے معاملہ میں وسعت اور نکلنے کی راہ پیدا فرما دے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، فرشتوں نے کہا: اے ہمارے معبود! ہم آواز اور دعا سنتے ہیں، آواز بچے کی ہے اور دعا نبی کی۔ ضحاک نے کہا: جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام پر اس حال میں اترے کہ آپ گہرے کنوئیں میں تھے تو جبریل علیہ السلام نے کہا: کیا میں آپ کو ایسے کلمات نہ سکھاوں کہ جن کو اگر تم کہو تو اللہ تعالیٰ جلدی تمہیں اس کنوئیں سے نکال لے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے ہر مصنوع کو بنانے والے، اے ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کرنے والے، اے ہر راز کے شاہد، اے ہر اجتماع کے حاضر، اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے، اے ہر اجنبی کے دوست اور اے ہر تنہا کے مونس! میرے لیے کشادگی اور امید کو لا اور اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میں تیرے سوا کسی کی امید نہ کروں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دعا کو اس رات بار بار دہرایا تو اللہ تعالیٰ نے اس دن صبح آپ کو اس کنوئیں سے نکالا (1)۔

وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً، عِشَآءً سے مراد لیلاً ہے یعنی رات کے وقت یہ ظرف ہے اور حال کی جگہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063

میں ہے، وہ رات کے وقت آئے تا کہ تاریکی میں زیادہ بہتر انداز میں عذر گھڑ سکیں، اسی وجہ سے کہا گیا ہے: رات کے وقت حاجت نہ مانگو، بے شک حیا دونوں آنکھوں میں ہے اور دن کے وقت گناہ سے عذر نہ کر تو عذر کرنے میں شرمندگی محسوس کرے گا۔ روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی گریہ زاری کو سنا تو فرمایا(1): تمہیں کیا ہوا؟ ریوڑ میں کوئی مسئلہ بن گیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: یوسف کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم دوڑ لگانے گئے تو بھیڑیا اسے کھا گیا، آپ روئے اور چیخے اور فرمایا: اس کی قمیص کہاں ہے؟ جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

سدی اور ابن حبان نے کہا: جب انہوں نے کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے تو انہوں نے آپ پر پانی ڈالا مگر آپ نے کوئی حرکت نہ کی اور انہوں نے آوازیں دیں مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا، وہب نے کہا: یہوذا نے اپنا ہاتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے منہ اور ناک پر رکھا تو اس نے سانس کی حرکت کو بھی محسوس نہ کیا اور نہ ہی آپ کی نبض چلی، تو یہوذا نے انہیں (دیگر بھائیوں کو) کہا: قیامت کے دن کے مالک کی طرف سے ہمارے لیے ہلاکت و بربادی ہو! ہم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا، اور اپنے باپ کو قتل کر دیا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو سحری کی ٹھنڈک سے کچھ افاقہ ہوا، آپ کو افاقہ ہوا تو آپ کا سر روبیل کی گود میں تھا، آپ نے فرمایا: اے روبیل! کیا میں نے تجھے اپنے بیٹے پر امین نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا؟ اس نے کہا: اے میرے باپ! اپنے رونے کو مجھ سے روکو، میں آپ کو بتاتا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رونا روکا تو اس نے کہا: اے میرے باپ: **اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ** ہم ذرا دوڑ لگانے گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ آدمی کا رونا(2) اس کی گفتگو کی سچائی پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ تصنع کر رہا ہو، تو مخلوق میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا، کہا گیا ہے: بناوٹی آنسو نہیں چھپ سکتا، جس طرح کہ حکیم نے کہا ہے:

إِذَا اشْتَبَكَتْ دُمُوْعٌ فِي خُدُوْدٍ   تَبَيَّنَ مَنْ بَكَى مِمَّنْ تَبَاكَى

جب آنسو رخساروں پر رہتے ہیں تو جو واقعی رو رہا ہو بناوٹی رونے والے سے واضح ہو جاتا ہے۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

"انہوں نے کہا بابا جی! ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس (ہائے افسوس) کھا گیا اس کو بھیڑیا، اور آپ نہیں مانیں گے اگرچہ ہم سچے ہیں"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ نَسْتَبِقُ باب افتعال ہے: مسابقہ (باہم دوڑ لگانا) سے، ایک قول ہے: یعنی ہم نیزہ بازی کر رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 193
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

تھے اسی طرح حضرت عبداللہ کی قراءت میں انا ذھبنا ننتضل ہے یہ بھی دوڑ کی ایک قسم ہے یہ زجاج کا قول ہے۔ ازھری نے کہا: نضال، تیروں میں ہوتا ہے اور رھان گھوڑے میں ہوتا ہے جبکہ مسابقہ کا لفظ ان دونوں کو جامع ہے۔ قشیری ابونصر نے کہا: نَسْتَبِقُ یعنی تیراندازی میں، یا گھوڑے پر یا پھر دوڑنے میں، دوڑنے میں مسابقہ سے مقصود دشمن کے خلاف سانس کی مشق ہے کیونکہ دشمن کے قتال میں اور ریوڑ سے بھیڑیے کو بھگانے میں یہ بھی ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سدی اور ابن حبان نے کہا: نَسْتَبِقُ سے مراد ہے کہ ہم نے دوڑ میں بہت زیادہ شدت اختیار کی تاکہ ہم دیکھیں کہ ہم سے کون زیادہ آگے بڑھتا ہے؟ ابن عربی نے کہا: سابقہ شریعت میں ایک طریقہ، عمدہ خصلت اور جنگ میں مددگار ہے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ایسا کیا اور اپنے گھوڑے کے ذریعے بھی مقابلہ فرمایا، اور آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ فرمایا تو آپ ان سے آگے نکل گئے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے (سن رسیدہ) ہوگئے تو آپ نے ان کے ساتھ مقابلہ کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے سبقت لے گئیں تو آپ نے فرمایا: ''یہ اس کا بدلہ ہے'' (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے ذی قرد سے مدینہ طیبہ کی طرف واپسی پر ایک آدمی کیساتھ مقابلہ کیا اور حضرت سلمہ بن اکوع سبقت لے گئے۔ (خرجہ مسلم)

مسئلہ نمبر 2۔ مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضمار شدہ گھوڑوں کے درمیان حفیاء سے لے کر ثنیۃ الوداع تک مقابلہ کرایا اور جن کو اضمار نہیں کیا گیا تھا ان کا مقابلہ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کرایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے درمیان مقابلہ کرایا گیا۔

اس باب میں یہ حدیث اپنے ضمن میں تین شرائط کو لیے ہوئے ہے جن کے بغیر مقابلہ جائز نہیں۔ ایک یہ کہ مقابلہ کی مسافت معلوم ہونی چاہیے۔ دوسری یہ کہ گھوڑے مساوی صفت کے ہونے چاہیں۔ تیسری یہ کہ مضمر گھوڑے کا مقابلہ غیر مضمر کے ساتھ ایک ہی مسافت اور ایک ہی مقصد کے لیے نہیں ہونا چاہیے، مقابلہ کی یہ سنت جن گھوڑوں میں ہوگی وہ وہ گھوڑے ہیں جن کو دشمن کے ساتھ جہاد کے لیے تیار کیا گیا ہو نہ کہ فتنوں میں مسلمانوں کے باہمی قتال کے لیے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نیزہ بازی اور اونٹ میں دوڑ کا مقابلہ کرانے کے متعلق امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا ہم ایک مقام پر رکے ہم میں سے کوئی چھپن چھوو کھیلنے لگا اور کوئی نیزہ بازی کرنے لگا اور انہوں نے حدیث کا ذکر کیا۔ نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیزہ بازی، اونٹوں کی دوڑ اور گھوڑوں کی دوڑ کے سوا کوئی مقابلہ نہیں''۔ نیزہ بازی کا ذکر ابن ابی ذئب عن نافع بن ابی نافع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔ اس کو نسائی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی حجاز اور عراق

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی السبق علی الرجل، جلد 1، صفحہ 348

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب حسن المعاشرۃ (روایت بالمعنی)، حدیث نمبر 1968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے فقہاء کہتے ہیں۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا وہ کبھی مقابلہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی تھی (حمید نے لاتسبق کے بعد أولا تکاد تسبق کے الفاظ بیان کیے ہیں)۔ایک مرتبہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر آیا اور وہ اس سے آگے نکل گیا تو مسلمانوں کو اس بات سے رنج ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ جو چیز بھی دنیا میں سربلند ہو وہ اس کو سرنگوں کر دے''(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ سوائے اونٹ، گھوڑے اور نیزہ بازی کے مقابلہ جائز نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ان تین کے علاوہ میں مقابلہ جوا ہے۔أبوالبختری قاضی نے الخف والحافر والنصل والی حدیث میں أوجناح کے الفاظ کی زیادتی کی ہے۔یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر بڑھائے علماء نے اسی وجہ سے اور اس کی دیگر موضوعات کی وجہ سے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہے۔علماء کسی بھی صورت میں اس کی حدیث کو نہیں لکھتے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: گھوڑے اور نیزہ بازی کے علاوہ کسی چیز میں مقابلہ نہیں کیونکہ یہی اہل حرب کے خلاف قوت ہیں۔اور کہا: ہمارے نزدیک نیزہ بازی کی نسبت گھوڑے کا مقابلہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

بعض علماء نے سوائے گھوڑے کے مقابلہ کے باقی ہر چیز میں شرط لگانے سے منع کیا ہے، کیونکہ عربوں کی یہی عادت تھی کہ وہ صرف گھوڑے میں ہی شرط لگاتے تھے۔عطا سے روایت ہے کہ ہر چیز میں شرط لگانا جائز ہے اور ان کے قول کی یہ تاویل کی جاتی ہے کیونکہ ان کا اس کو عموم پر محمول کرنا تو جوئے کی اجازت کا سبب بنے گا حالانکہ یہ تو بالاتفاق حرام ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔گھوڑے اور اونٹ میں مقابلہ صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جب مسافت اور اس کی انتہا معلوم ہو جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔اسی طرح نیزہ بازی میں مقابلہ جائز نہیں مگر جب اس کی غایت معلوم ہو اور کمان بھی معلوم ہو، اور ٹارگٹ کی صورت کا علم ہو، اس ٹارگٹ کو پار کرنے کی شرط لگائی گئی ہو یا بغیر شرط کے پار ہو جائے۔دوڑ میں سبقت کی تین صورتیں ہیں: حاکم یا حاکم کے علاوہ کوئی اور آدمی اپنے پاس سے رقم دے اور سبقت لے جانے والے کے لیے معلوم رقم کو مختص کر دے اب جو بھی سبقت لے گا وہ رقم لے لے گا۔دو آدمی مقابلہ کریں، دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک رقم نکالے جبکہ دوسرا رقم نہ دے اگر دوسرا آدمی سبقت لے گیا تو وہ اس رقم کو حاصل کر لے گا۔مقابلے کی تیسری صورت میں اختلاف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر ایک برابر رقم دیں اور یہ شرط لگالیں کہ جو بھی سبقت لے گیا وہ ساری رقم لے لے گا۔پھر جو سبقت لے گیا اس نے دونوں کی رقم لے لی۔یہ صورت جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے درمیان ایک ایسے محلل کو داخل کریں جس سے ان دونوں کو یہ خطرہ ہو کہ وہ ان سے سبقت لے جا سکتا ہے پس اگر محلل سبقت لے گیا تو وہ ان دونوں کی رقم حاصل کر لے گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی نے سبقت لی تو جس نے بھی سبقت لی وہ دونوں کی رقم لے لے گا۔اور محلل کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی چیز دینی ہوگی اور اگر دوسرے نے صرف تیسرے پر سبقت حاصل کی تو گویا اس نے کسی پر بھی سبقت حاصل نہیں کی۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ابوعلی بن خیران نے کہا: محلل گھوڑے کا حکم یہ ہے کہ

1۔مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 447

اس کی دوڑ کے بارے میں معلوم نہ ہو اور اس کو محلل اس وجہ سے کہتے ہیں کیونکہ وہ دو مقابلہ کرنے والوں کے مقابلہ کو حلال کرتا ہے یا خود اپنے مقابلے کو حلال کرتا ہے۔ اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان محلل نہ ہو اور دو مقابلہ کرنے والوں نے یہ شرط لگائی ہو کہ جس نے بھی سبقت لی وہ اپنی رقم اور دوسرے کی رقم لے لے گا تو یہ صراحتاً جوا ہے اور جائز نہیں ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، آپ نے فرمایا: ''جس آدمی نے دو گھوڑوں کے درمیان ایک گھوڑا اڑالا جس کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ سبقت لے جائیگا تو یہ جوا نہیں اور اس نے ایسا گھوڑا اڑالا جس کے بارے میں سبقت لے جانے کا خطرہ نہیں تھا تو یہ جوا ہے''۔

موطاء میں حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے انہوں نے کہا: گھوڑوں کی دوڑ میں شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان میں محلل داخل ہو پس اگر وہ سبقت لے جائے تو انعام حاصل کرلے گا اور اگر دوسرے گھوڑے سبقت لے جائیں تو اس محلل پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔ اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، ایک قول یہ ہے کہ گھوڑوں میں محلل کو لانا لازم نہیں اور ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کو نہیں لیتے، پھر آپ نے کہا: محلل کے بغیر مقابلہ جائز نہیں، آپ کا یہی قول زیادہ عمدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ گھوڑے اور اونٹ کے مقابلے میں صرف نوجوان (بالغ) آدمی کو ہی سوار کیا جائے گا، اور اگر گھوڑوں کے مالک خود سوار ہوں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: مقابلہ میں گھوڑوں پر صرف ان کے مالک ہی سوار ہوں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مقابلہ کی کم از کم صورت یہ ہے کہ وہ گردن سے آگے بڑھے یا اس کے بعض حصے سے آگے بڑھے، یا پھر اس کے پچھلے حصے یا اس کے بعض سے آگے بڑھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نیزہ بازی کے مقابلہ کی بھی یہی صورت ہوگی۔ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ مقابلہ کیا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہنچے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے کے دھڑ کے قریب تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تیسرے نمبر پر تھا۔

وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا یعنی اپنے کپڑوں اور سامان کے پاس نگرانی کے لیے۔ **فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ** جب انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: **وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ** مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے تو انہوں نے اس وجہ سے یہی کہا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پائے جانے والے اندیشوں میں یہ زیادہ ظاہر تھا۔ **وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا** مومن سے مراد تصدیق کرنے والا۔ **وَلَوْ كُنَّا** یعنی ان کنا یہ مبرد اور ابن اسحاق کا قول ہے۔ **صٰدِقِيْنَ** یعنی اپنی بات میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تصدیق اس وجہ سے نہ کی کہ آپ کے سامنے ان کی طرف سے کہی جانے والی باتوں کے خلاف بہت سے دلائل ظاہر ہو چکے تھے جس طرح کہ ان کا بیان آئے گا۔ ایک قول یہ ہے: **وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ** یعنی اگر ہم آپ کے نزدیک سچے اور قابل اعتماد بھی ہوتے پھر بھی آپ ہم پر جھوٹ کی تہمت لگاتے اور آپ ہماری تصدیق نہ کرتے کیونکہ آپ

کو یوسف سے شدید محبت ہے۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸

''اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر، آپ نے فرمایا: (غلط کہتے ہو یوں نہیں) بلکہ آراستہ کر دکھایا ہے تمہیں تمہارے نفسوں نے اس (سنگین جرم) کو، (اس جانکاہ حادثہ پر) صبر جمیل کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا اس پر جو تم بیان کرتے ہو''۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِدَمٍ كَذِبٍ مجاہد نے کہا: وہ بکری یا بھیڑ کے بچے کا خون تھا (1) جس کو انہوں نے ذبح کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ ہرن کا خون تھا وجاء وا علی قمیصہ بدم مکذوب فیہ دم کی صفت مصدر کیساتھ لگائی گئی تو تقدیر عبارت یوں ہوگی: بدم ذی کذب جیسے واسال القریہ بعض اوقات فاعل اور مفعول دونوں کا نام مصدر کے ذریعے رکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: هذا ضرب الامیر یعنی مضروبہ، اسی طرح ماء سکب یعنی مسکوب، ماء غور یعنی غائر اور رجل عدل یعنی عادل۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بدم کذب پڑھا ہے دال کیساتھ یعنی تازہ خون کے ساتھ، تازہ خون کو الکذب کہا جاتا ہے، اور انہوں نے یہ بھی حکایت کیا ہے کہ تبدیل ہوا خون ہے۔ یہ شعبی کا قول ہے۔ اور الکذب اس سفیدی کو بھی کہتے ہیں جو احداث کے ناخنوں میں نکلتی ہے؛ تو ہو سکتا ہے کہ قمیص میں خون اس سفیدی کے مشابہ ہو جو رنگوں کے اختلاف کی صورت میں ناخن میں نکلتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا: جب انہوں نے خون کو اپنی سچائی کی علامت بنانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے علامت کو اس کے معارض علامت بنا دیا اور وہ ہے قمیص کا پھٹنے سے محفوظ رہنا: کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کو پھاڑے اور آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہو اور قمیص پھٹنے سے محفوظ رہی۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص میں غور و فکر کیا اور اس میں کوئی پھٹن اور اثر نہ پایا تو اس کے ذریعے آپ نے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا اور انہیں کہا: یہ بھیڑیا حکیم کب کا بن گیا ہے کہ یوسف کو کھاتا ہے اور قمیص نہیں پھاڑتا (2)؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کا قول ہے۔ اسرائیل نے سماک بن حرب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: خون بکری کے بچے کا تھا۔ سفیان نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا آپ نے کہا: جب آپ (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اس کی طرف دیکھا تو فرمایا: تم نے جھوٹ بولا، اگر بھیڑیے نے کھایا ہوتا تو ضرور قمیص پھٹتی۔ ماوردی نے حکایت کی کہ قمیص کے بارے میں تین نشانیاں ہیں (3)۔ جب وہ اس پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے، جس وقت پیچھے سے آپ کی قمیص کو پھاڑا گیا اور جس وقت آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 194 | 2۔ ایضاً | 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1077

کے باپ کے چہرے پر اسے ڈالا گیا اور بینائی لوٹ آئی۔

میں نے کہا: یہ مردود ہے، پس وہ قمیص جس پر وہ خون لگا کر لائے وہ اس کے علاوہ تھی جس کو پھاڑا گیا اور جس کے ذریعے خوشخبری لائی گئی۔ ایک قول یہ ہے: وہ قمیص جس کو پھاڑا گیا وہ وہی تھی جس کو لانے کی وجہ سے بینائی واپس آ گئی جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ سورت کے آخر میں آئے گا، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: بلکہ چوروں نے اسے قتل کیا ہے، ان کے قول مختلف ہو گئے تو آپ نے ان پر الزام لگایا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو کہا: تم یہ گمان کرتے ہو کہ بھیڑیے نے اسے کھا لیا ہے، اگر اس نے اسے کھایا ہوتا تو اس کی جلد تک پہنچنے سے پہلے اس کی قمیص ضرور پھٹ گئی ہوتی حالانکہ مجھے قمیص میں کوئی پھٹن دکھائی نہیں دے رہی اور تمہارا یہ گمان ہے کہ چوروں نے اسے قتل کر دیا ہے، اگر وہ اسے قتل کرتے تو وہ اس کی قمیص ضرور لے لیتے وہ تو کپڑے ہی لیتے ہیں، تو اس وقت انہوں نے کہا: وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ حضرت حسن اور دیگر سے ہی روایت ہے یعنی اگر ہم سچائی کے ساتھ موصوف بھی ہوں تب بھی آپ ہم پر ضرور الزام لگائیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ فقہاء نے اس آیت کے ذریعے فقہ کے مسائل میں نشانیوں کو عمل میں لانے پر استدلال کیا ہے جس طرح قسامت وغیرہ، اور اس پر اجماع ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص کے صحیح ہونے کے ذریعے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اسی طرح اگر علامات میں تعارض واقع ہو جائے تو دیکھنے والے کو علامات اور نشانیوں کو دیکھنا چاہیے اور ان میں سے جو ترجیح پا جائیں جانب ترجیح کے ذریعے فیصلہ دینا چاہیے اور یہ الزام کی قوت ہے اور اس کے ذریعے فیصلہ دینے میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ابن عربی کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو انہوں نے کہا: فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ آپ نے انہیں کہا: کیا بھیڑیے نے اس کا کوئی عضو نہیں چھوڑا وہ میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اس کے ذریعے انس حاصل کروں؟ کیا اس نے میرے لیے کوئی کپڑا نہیں چھوڑا جس میں میں اس کی خوشبو سونگھوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہ اس کی قمیص ہے جو اس کے خون میں لت پت ہے، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام روئے اور اپنے بیٹوں کو کہا: اس کی قمیص مجھے دکھاؤ، انہوں نے قمیص دکھائی آپ نے اس کو سونگھا اور چوما، پھر آپ اس کو الٹ پلٹ کرنے لگے تو اس میں کوئی سوراخ اور پھٹن دکھائی نہ دیا تو آپ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! میں نے آج تک ایسا مضبوط بھیڑیا نہیں دیکھا وہ میرے بیٹے کو کھا گیا اس نے اسے قمیص سے ایسے نکال لیا ہے کہ قمیص کو بالکل پھاڑا ہی نہیں اور آپ کو پتا چل گیا کہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے کہا ہے اور یہ معلوم ہو گیا کہ بھیڑیے نے اسے نہیں کھایا، آپ نے ناراض شخص کی طرح ان سے اعراض کر لیا اس حال میں کہ آپ پریشان بھی تھے اور رو بھی رہے تھے اور کہا: اے میرے بیٹوں کی جماعت! میرے بیٹے کی طرف میری رہنمائی کرو اگر وہ زندہ ہوا تو میں اسے اپنے پاس لے

آؤں گا اور اگر مردہ ہوا تو میں اس کا کفن دفن کروں گا۔ تو اس وقت انہوں نے کہا: ہمارے باپ کو دیکھو کس طرح ہماری گفتگو کی تکذیب کرتا ہے؟ آؤ اسے کنویں سے نکالیں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اپنے باپ کے پاس اس کا کوئی عضو لے آئیں تا کہ یہ ہماری گفتگو کی تصدیق کرے اور اس کی امید ختم ہو، یہوذا نے کہا: اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو میں جب تک زندہ رہوں گا تمہارا دشمن بن جاؤں گا اور تمہارے باپ کو تمہاری بری کاروائی سے آگاہ کروں گا، انہوں نے کہا: اگر تو ہمیں اس کام سے روکتا ہے تو آؤ ہم کسی بھیڑیے کا شکار کریں، اس نے کہا: انہوں نے بھیڑیے کا شکار کیا اسے خون میں لت پت کیا اور رسیوں کے ساتھ باندھ دیا پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اے ہمارے باپ! یہ وہ بھیڑیا ہے جو ہمارے ریوڑ کا نقصان کرتا ہے ان کی چیر پھاڑ کرتا ہے اور شاید یہ وہی ہے جس نے ہمارے بھائی کو قتل کر کے ہمیں اذیت دی ہے ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں اور یہ اس پر اس کا خون بھی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اس کو چھوڑ و، انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو بھیڑیا آپ کی خاطر اپنی دم ہلانے لگا اور آپ کے قریب ہونے لگا حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: قریب آ، قریب آ یہاں تک کہ آپ نے اس کے رخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: اے بھیڑیے! تو نے مجھے میرے بیٹے کی وجہ سے کیوں تکلیف پہنچائی اور مجھے لمبی پریشانی کا وارث بنا دیا؟ پھر کہا: اے اللہ! اسے قوت گویائی دے، تو اللہ نے اسے قوت گویائی دے دی، اس نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو نبی چن لیا ہے نہ میں نے اس کا گوشت کھایا، نہ میں نے اس کے کپڑے پھاڑے اور نہ ہی میں نے اس کا کوئی بال بیکا کیا، اور اللہ کی قسم! اور نہ ہی مجھے آپ کے بیٹے کے بارے میں کوئی خبر ہے، میں تو ایک اجنبی بھیڑیا ہوں مصر کے نواحی علاقے سے اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش میں آیا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ پھر آپ کے بیٹوں نے مجھے شکار کر کے باندھ دیا ہے، بے شک انبیاء کے گوشت مجھ پر اور تمام وحشی جانوروں پر حرام ہیں، اور اللہ کی قسم! میں ایسے شہروں میں نہیں رہتا جن میں انبیاء کی اولاد یں جانوروں پر جھوٹے الزام لگائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا: اللہ کی قسم! تم تو اپنے خلاف میرے پاس حجت لائے ہو، یہ بھیڑیا ایک جانور ہے جو اپنے بھائی کی تلاش میں اس کے پیچھے نکلا ہوا ہے اور تم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھیڑیا اس الزام سے بری ہے جس میں پکڑ کے تم اسے لائے ہو۔ **بَلْ سَوَّلَتْ** یعنی مزین کر دیا **لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا** تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایسا معاملہ جو اس کے علاوہ ہے جس کو تم بیان کرتے ہو اور جس کا تم تذکرہ کرتے ہو۔ پھر آپ نے اپنی تسلی کے لیے فرمایا: **فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ**۔

مسئلہ نمبر 2۔ زجاج نے کہا: یعنی میرا مقام اور جس کا میں عقیدہ رکھتا ہوں **فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ** ہے۔ قطرب نے کہا: یعنی میرا صبر، صبر جمیل ہے ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ صبر جمیل میرے لیے زیادہ مناسب ہے، یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبر جمیل کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: ''صبر جمیل وہ ہے (1) جس کے ساتھ شکوہ نہ ہو''۔ انشاء اللہ اس کا بیان سورت کے آخر میں آئے گا۔ ابو حاتم نے کہا: عیسیٰ بن عمر نے سہل بن یوسف

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 197

کے گمان کے مطابق فصبراً جمیلاً پڑھا ہے، اس نے کہا: اور اسی طرح اشہب عقیلی نے پڑھا ہے، اسی طرح مصحف انس اور ابی صالح میں ہے۔ مبرد نے کہا: فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ رفع کے ساتھ پڑھنا نصب کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ معنی یہ ہے: قال رب عندی صبر جمیل اس نے کہا: نصب صرف مصدر کی بنیاد پر ہے، یعنی فلأصبرن صبرا جمیلا، (شاعر نے) کہا:

شکا الی جملی طول السری صبرا جمیلا فکلانا مبتلی

صبر جمیل وہ ہے جس میں نہ جزع ہو اور نہ شکوہ ہو۔ ایک قول یہ ہے۔ اس کا معنی یہ۔ ہے کہ میں تمہارے ساتھ غمگین چہرے اور پیشانی پر بل ڈال کر نہیں رہوں گا بلکہ میں تمہارے ساتھ جس حالت میں پہلے تھا اسی حالت میں رہوں گا، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آپ نے انہیں مواخذہ سے معاف کر دیا تھا۔ حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھنویں ان کی دونوں آنکھوں پر گر گئی تھیں اور کسی کپڑے کے ساتھ انہیں اٹھاتے تھے۔ آپ کو کہا گیا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: زمانے کی طوالت اور پریشانیوں کی کثرت، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: اے یعقوب علیہ السلام! کیا مجھ سے شکوہ کرتا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! یہ غلطی ہے جو مجھ سے سرزد ہو گئی پس تو مجھے معاف فرما (1)۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ یہ مبتدا اور خبر ہے عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی اس احتمال پر جو تم کذب میں سے بیان کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن ابی رفاعہ نے کہا: اہل رائے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے گمان کے وقت (ایک مرتبہ آپ کا گمان درست تھا جبکہ دوسری دفعہ درست نہیں تھا) اپنی رائے کو درست کرنا چاہیے۔ جب آپ کے بیٹوں نے آپ کو کہا: اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ تو آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ تو یہاں آپ کا گمان درست تھا۔ پھر انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝ (یوسف) آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا تو یہاں آپ کا گمان درست نہ تھا۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

"اور (تھوڑی دیر بعد) ایک قافلہ آیا تو اہل قافلہ نے (پانی لانے کے لیے) آبکش بھیجا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، وہ پکار اٹھا: مژدہ باد! (تو کتنا من موہنا) بچہ ہے۔ اور انہوں نے چھپا دیا اسے متاع (گرانبہا) سمجھتے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ یعنی گزرنے والا قافلہ جو شام سے مصر کی طرف چل رہا تھا وہ راستہ بھول گئے اور تھک گئے یہاں تک کہ انہوں نے کنویں کے قریب پڑاؤ ڈالا اور کنواں آبادی سے دور صحراء میں تھا۔ وہ چرواہوں کے لیے تھا اور اس کا پانی کھاری تھا لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تو وہ میٹھا ہو گیا۔ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا گیا کیونکہ اگر لفظوں کا اعتبار ہوتا تو فارسلت واردھم ہوتا جس طرح کہ وَجَآءَتْ ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 198

وارد سے مراد وہ شخص ہے جو پانی کے پاس جاتا ہے تاکہ لوگوں کو پانی پلائے اس کا نام مالک بن دعر تھا وہ عرب عاربہ سے تھا۔ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ یعنی أرسلہ ادلی دلوہ کہا جاتا ہے جب وہ اس (ڈول) کو ڈالے تاکہ وہ اسے پانی سے بھرے۔ اور ''دلاھا'' سے مراد ہے کہ اس نے اسے نکالا۔ اصمعی وغیرہ سے منقول ہے: دلا یدلو دلوا سے مراد جَذَبَ اور اَخْرَجَ ہے اسی طرح ادلی ہے جب وہ اسے پھینکے، اور جب یہ ثقیل ہو جائے تو پھر یہ واوی کے بجائے یائی ہو جاتا ہے کیونکہ یا، واو کی نسبت زیادہ خفیف ہے یہ کوفیوں کا قول ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: جب یہ تین حروف سے تجاوز کر جائے تو یائی ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی اتباع کرتے ہوئے دلو کی جمع قلت أدل آتی ہے اور جب کثرت بنائی ہو تو ''دُلِیّ اور دِلِیّ'' آتی ہے پس واو کو یا سے بدل دیا جاتا ہے۔ البتہ جمع کا باب مختلف ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ واحد اور جمع میں فرق کیا جائے اور دلاء بھی آتی ہے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام رسی کے ساتھ چمٹ گئے جب باہر نکلے تو آپ چودھویں کے چاند کی طرح حسین بچے تھے اور عام بچوں کی نسبت زیادہ خوبصورت تھے۔ صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث اسراء میں فرمایا: ''تو میں یوسف کے پاس تھا جن کو حسن کا ایک حصہ عطا فرمایا گیا ہے''(1)۔ کعب احبار نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام خوبصورت چہرے والے، گھنے بالوں والے، موٹی آنکھوں والے، معتدل تخلیق والے، سفید رنگ والے، سخت کلائیوں اور پنڈلیوں والے، دبلے پیٹ والے اور چھوٹی ناف والے تھے، جب آپ مسکراتے تو آپ کی مسکراہٹ سے روشنی دکھائی دیتی اور جب آپ گفتگو کرتے تو آپ کے کلام میں آپ کے دانتوں سے سورج کی شعاع دیکھتا، کوئی آدمی بھی اس صورت کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور آپ کا حسن رات کے وقت دن کی روشنی کی طرح تھا۔ جس دن حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا اور ان میں اپنی روح پھونکی اس دن جو کیفیت آپ کی تھی آپ سے خطا سرزد ہونے سے پہلے پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کی اس حالت کے مشابہ تھے۔ ایک قول یہ ہے: آپ کو یہ خوبصورتی اپنی جدہ حضرت سارہ سے وراثت میں ملی تھی ان کو حسن کا چھٹا حصہ عطا کیا گیا تھا۔ جب مالک بن دعر نے آپ کو دیکھا تو کہا: یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قرات ہے سوائے ابن ابی اسحاق کے کہ اس نے یٰبُشْرَیَّ هٰذَا غُلٰمٌ پڑھا۔ اس نے الف کو یا سے بدل دیا کیونکہ یا ماقبل کو کسرہ دیتی ہے اور جب الف کو کسرہ دینا جائز نہیں تو اس کے عوض اسے ''یا'' سے بدل دیا گیا، جبکہ اہل کوفہ نے ''یا بشری'' پڑھا ہے بغیر اضافت کے اس کے معنی کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ...... یہ بچے کا نام ہے۔ اور دوسرا...... اے بشری یہ تیرا زمانہ اور تیرا مقام ہے۔

قتادہ اور سدی نے کہا: جب ڈول والے نے اپنا ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لپٹ گئے تو اس نے کہا: یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ۔ قتادہ نے کہا: اس نے اپنے دوستوں کو خوشخبری دی کہ اس نے غلام پالیا ہے۔

سدی نے کہا: اس نے ایک آدمی کو پکارا جس کا نام بشری تھا(2)۔ نحاس نے کہا: قتادہ کا قول زیادہ بہتر ہے، کیونکہ قرآن میں بہت کم کسی کا نام آیا ہے، بلکہ قرآن میں کنایۃً ذکر آتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ (الفرقان: 27) اس سے مراد عقبہ بن معیط ہے اس کے بعد فرمایا: لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ﴿۲۸﴾ (الفرقان) یہ امیہ بن

1۔ صحیح مسلم، حدیث الاسراء، جلد 1، صفحہ 91
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 199

خلف ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ بشریٰ کی ندا کا معنی ہے: جو حاضر ہے اس کے لیے خوشخبری ہے۔ اور یہ تبشرات کے قول سے زیادہ مؤکد ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: یا عجباہ، یعنی یا عجب ھذا من أیامك وأیاتك، فاحضر، یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح سہیلی نے کہا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اس طرح ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: وا سرورا ہ! البشریٰ۔ یہ الاستبشار سے مصدر ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اگر یہ اسم علم ہوتا تو ضمیر کی طرف مضاف نہ ہوتا۔ اس صورت میں بشریٰ محل نصب میں ہوتا، کیونکہ یہ ندا مضاف ہے اور ندا کا معنی بیان تنبیہ ہے یعنی انبتھوا لفرحتی وسروری، اور سدی کے قول کے مطابق یہ محل رفع میں ہوگا جس طرح آپ کہتے ہیں: یا زید ھذا غلام۔ اس کا محل نصب میں ہونا بھی ممکن ہے جس طرح یا رجلا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰحَسۡرَةً عَلَی الۡعِبَادِ (یٰسین: 30) البتہ بشریٰ منون نہیں کیونکہ یہ غیر منصرف ہے۔

وَ اَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً، ہ ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام سے کنایہ ہے جبکہ واو جمع آپ کے بھائیوں سے کنایہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ان تاجروں سے کنایہ ہے جنہوں نے آپ کو خریدا تھا۔ ایک قول یہ ہے: یہ کنوئے پر وارد ہونے والے آدمی اور اس کے دوسرے دوستوں سے کنایہ ہے۔ بِضَاعَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مجاہد نے کہا: مالک بن دعر اور اس کے دوستوں نے آپ کو ان تاجروں سے چھپایا جو ان کے ساتھ اس جماعت میں تھے۔ انہوں نے انہیں کہا: یہ سامان ہے اہل شام میں سے کسی نے یا اس پانی والوں میں سے کسی نے یہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم اسے مصر پہنچا دیں۔ اور انہوں نے یہ بات صرف اس خوف سے کی کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک نہ ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو (قیمتی) سامان سمجھ کر چھپا لیا جب آپ نے کنوئے سے نکلنا چاہا۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: تم نے کتنا برا کام کیا ہے، یہ تو ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اور انہوں نے عبرانی زبان میں حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: یا تو ہماری غلامی کا اقرار کرو تو ہم تمہیں ان کے ہاتھوں بیچ دیں گے یا ہم تجھے لے لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ تو آپ نے کہا: میں تمہاری غلامی کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ نے ان کی غلامی کا اقرار کیا تو انہوں (بھائیوں) نے آپ کو ان (قافلے والوں) کے ہاتھوں بیچ دیا: ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے آپ کو کہا کہ آپ اپنے بھائیوں کی غلامی کا اعتراف کر لیں ورنہ مجھے ڈر ہے کہ یہ آپ کو قتل کر دیں گے۔ تو اس طرح شاید اللہ تعالیٰ آپ کے لیے نکلنے کی کوئی راہ بنا دے اور آپ قتل سے نجات پا لیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے قتل کے خوف سے اپنی حقیقی صورتحال چھپا لی۔ مالک نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ غلام کی نشانی نہیں ہے۔ انہوں (بھائیوں) نے کہا: اس نے ہماری گود میں پرورش پائی ہے۔ ہمارے اخلاق سے مزین ہوا ہے اور ہمارے آداب سیکھے ہیں۔ تو اس نے کہا: اے بچے تو کیا کہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا ہے، میں نے ان کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ان کے اخلاق سے مزین ہوا ہوں، تو مالک بن دعر نے کہا: اگر تم اسے میرے ہاتھ بیچو تو میں اسے تم سے خرید لیتا ہوں۔ تو انہوں نے آپ کو اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب ہے۔

وَ شَرَوۡهُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَ كَانُوۡا فِیۡهِ مِنَ الزّٰهِدِیۡنَ ۝

''اور انہوں نے بیچ ڈالا یوسف علیہ السلام کو حقیر سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اور وہ (پہلے ہی) اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ شَرَوْهُ، شریت بمعنی اشتریت ہے۔ اسی طرح شریت بمعنی بعت بھی ہے یعنی (خریدنا اور بیچنا دونوں معنی میں یہ مستعمل ہے) شاعر نے کہا:

وشَرَيْتُ بُرْدًا لَيْتَنِي مِنْ بَعْدِ بُرْدٍ كنتُ هَامَهْ (1)

اس میں شریت بمعنی بعت ہے یعنی میں نے چادر بیچی

دوسرے شاعر نے کہا:

فلما شَرَاها فاضتِ العينُ عبرةً وفي الصَّدرِ حُزّازٌ من اللَّوْمِ حَامِزُ

اس میں بھی شراہا سے مراد بیچنا ہے۔

بِثَمَنٍ بَخْسٍ یعنی تھوڑی قیمت۔ یہ یہاں مصدر ہے جسے اسم کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے، یعنی اصل میں ہے باعوہ بثمن مبخوس یعنی منقوص۔ آپ کے بھائی آپ کی قیمت کے ذریعے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ اپنے باپ سے دور ہو جائیں۔ ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے دور سے دیکھا کہ یوسف کو کنوئے سے نکالا گیا ہے تو اس نے دوسرے بھائیوں کو بتایا، وہ آئے اور انہوں نے آپکو آپ کی کے ہاتھوں بیچ دیا، جبکہ ایک قول یہ ہے: نہیں بلکہ وہ تین فرلانگ کے فاصلہ سے خبر کی تصدیق کرنے کیلئے واپس آئے تو انہوں نے قافلہ کے نشانات دیکھے تو وہ ان کے پیچھے گئے اور انہیں کہا: یہ ہمارا غلام ہے جو ہم سے بھاگا ہوا ہے تو اس طرح انہوں نے آپکو اس کے ہاتھ بیچا۔ قتادہ نے کہا: بخس بمعنی ظلم ہے۔ ضحاک، مقاتل، سدی اور ابن عطا نے کہا: بخس بمعنی حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کا کوئی خاص معنی نہیں بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری قیمت نہیں لگائی (2)، کیونکہ اگر آپ کے بھائیوں نے آپ کو بیچا تو وہ آپ کی قیمت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف آپ کو باپ کے سامنے سے دور کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر وارد ہونے والوں نے آپ کو بیچا تو انہوں نے آپ کو اپنا بناتے ہوئے مخفی رکھا، یا انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا: ہمارے ساتھ کچھ سامان بھیجو تو انہوں نے سوچا کہ انہیں اس کے بدلے میں کوئی ثمن ادا نہیں کیے گئے اور جو کچھ انہوں نے اس میں سے لیا ہے وہ سارے کا سارا منافع ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: ابن عربی کا قول وانما الاشارۃ فیہ الی انہ لم یستوف ثمنہ بالقیمۃ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر وہ آپ کی پوری قیمت وصول کرتے تو پھر یہ بیع جائز ہوتی حالانکہ ایسا نہیں۔ یہ بات سدی وغیرہ کی بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے ایسی ذات پر بیع کی ہے جس کو بیچنا ہی جائز نہیں تھا پس اسی لیے ان کے لیے اس کی قیمت

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 202

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

حلال نہ تھی۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: بخس کا معنی ہے قلیل یعنی تھوڑا (1)۔ ابن حیان نے کہا: اس کا معنی زیف یعنی کھوٹا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ کو بیس درہموں میں فروخت کیا اور آپ کے بھائیوں میں سے ہر ایک نے دو درہم لیے اور وہ کل دس تھے۔ یہی قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے کہا: بائیس درہموں میں (انہوں نے آپ کو فروخت کیا) اور وہ کل گیارہ تھے ہر ایک نے دو دو درھم لیے۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: چالیس درہم کے بدلے آپ کو بیچا گیا۔ لیکن جو کچھ صحابہ سے مروی ہے وہ زیادہ اولیٰ ہے۔ اور بخس یہ ثمن کی صفت ہے۔ دراہم یہ ثمن کا بدل اور اس کی تفسیر ہے۔ اور کہا جاتا ہے دراہم اس بنیاد پر ہے کہ یہ درہام کی جمع ہے۔ اور بعض اوقات یہ اسم جمع بھی ہوتا ہے سیبویہ کے نزدیک۔ اور سیبویہ کے نزدیک ہی مد کسرہ کی وجہ سے یا بن جاتی ہے مگر یہ مد مقصور کی طرح نہیں کیونکہ بصریوں کے نزدیک مد مقصور جائز نہیں نہ شعر میں اور نہ ہی غیر شعر میں، نحویوں نے اس پر شعر بھی پیش کیا ہے:

تَنْفِي يداها الحصى في كلِّ هاجرة نَفْيَ الدَّراهِيمِ تَنْقَادُ الصَّيَارِيفِ

اس میں بھی دراہم کے بجائے الدارھیم ہے۔

مَعْدُوْدَةٍ یہ صفت ہے۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ ان کے ہاں ثمن گن کر دیئے جاتے تھے نہ کہ وزناً۔ ایک قول یہ ہے۔ یہ قلت ثمن سے عبارت ہے، کیوں کہ دارہم اتنے نہ بنتے تھے کہ ان کا وزن کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''اوقیہ'' سے کم کا وزن نہیں کرتے تھے اور اوقیہ سے مراد چالیس درہم ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے: نقدین کی اصل تو وزن ہے (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تبیعو الذھب بالذھب ولا الفضتہ بالفضۃ إلا وزنًا من زاداو ازداد فقد اربیٰ (3) تم سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر وزن کر کے جس نے زیادتی کی یا زیادتی چاہی تو اس نے سودی کام کیا۔

اور وزن کا فائدہ سوائے مقدار کے اور کوئی نہیں، جہاں تک عین وزن کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی منفعت نہیں، مگر اس میں عدد کو جاری کر دیا گیا کثرت معاملہ کی وجہ سے لوگوں سے تخفیف کرتے ہوئے، تو اس وجہ سے پھر وزن کرنا ختم ہو گیا، یہاں تک کہ اگر مثقال یا درہم بنائے جائیں تو ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز ہوگی بشرطیکہ اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور نہ ہی ایک دوسرے سے راجح ہوں۔ پس اگر اس میں نقصان ہو تو پھر معاملہ وزن کے ساتھ ہوگا، اسی وجہ سے اس کو توڑنا یا کاٹنا فساد فی الارض میں سے ہے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا دراہم و دنانیر کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ معین ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں امام مالک سے بھی مختلف روایات ہیں۔ اشہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معین نہیں یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر قول ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ ابن قاسم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معین ہے۔ اس نے یہ کرخی سے حکایت کیا ہے۔ یہی امام شافعی کا قول بھی ہے۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ یہ معین نہیں ہوتے تو اس صورت میں جب کوئی آدمی کہے گا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 205 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079 3۔ صحیح مسلم، باب الربا، جلد 2، صفحہ 24

بعتك هذه الدنانير بهذه الدراهم کہ میں نے تجھے یہ دینار ان دراہم کے بدلے میں بیچے تو اس صورت میں تو دینار، دینا روالے کے ذمے ہو جائیں اور دراہم، دراہم والے کے ذمے اور معین ہوں پھر ضائع ہو جائیں تو ان دونوں کے ذمے کوئی شے نہیں ہوگی اور جس طرح عروض وغیرہ میں سے اعیان کی بیع باطل ہو جاتی ہے اسی طرح یہ عقد بھی باطل ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لقیط کے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ آزاد ہے اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ پڑھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بھائی ہیں۔ ایک قول کے مطابق: قافلہ والے ہیں۔ ایک قول کے مطابق: آبکش مراد ہے۔ جو بھی مراد ہے یہ ان کے نزدیک قابل رشک نہیں تھے۔ نہ ہی بھائیوں کے نزدیک؛ کیونکہ ان کا مقصد مال کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف باپ کی آنکھوں سے ان کو اوجھل کرنا مقصود تھا۔ اور نہ ہی قافلہ والوں کے نزدیک کیونکہ انہیں آپ کے بھائیوں نے کہا تھا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اور زھد سے مراد قلت رغبت ہے۔ اور نہ ہی آبکش کے نزدیک کیونکہ اس کو دوسرے دوستوں کی شراکت داری کا خوف تھا۔ اور ان کا خیال ہے کہ ثمن میں سے قلیل انفراد میں اولیٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں کسی بڑی چیز کو انتہائی تھوڑی قیمت کے بدلے میں خریدنے کے جواز پر دلیل ہے اور یہ بیع بھی لازم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کسی نے اگر کوئی بہت بڑا درہ ایک درہم کے بدلے بیچا پھر کہا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ درہ ہے، میں نے تو اسے مخشلبہ (موتی کی شکل کا سفید کچ) سمجھا تو اسے بیع لازم ہو جائے گی اور اس کی گفتگو کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ سے مراد ہے کہ وہ آپ کے حسن میں رغبت نہ رکھتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا نصف حصہ عطا فرمایا مگر آپ کی عزت و تعظیم کے طور پر قوم کے نفوس کی رغبت کو آپ سے پھیر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ آپ کے مقام و مرتبہ کو نہ جانتے تھے (1)۔ سیبویہ اور کسائی نے بیان کیا: زَهِدت وزَهَدت یعنی ہاء کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا اہل مصر سے اپنی بیوی کو عزت و اکرام سے اسے ٹھہراؤ شاید یہ ہمیں نفع پہنچائے یا بنالیں ہم اسے اپنا فرزند اور یوں (اپنی حکمت کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین میں اور تاکہ ہم سکھا دیں اسے خوابوں کی تعبیر، اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے ہر کام پر لیکن اکثر لوگ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 207

(اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ ایک قول یہ ہے؛ یہاں الاشتراء یعنی الاستبدال ہے کیونکہ یہ عقد نہیں تھا۔ جس طرح: اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ: 16) ہے یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدا (تبدیل کیا)

ایک قول یہ ہے: انہوں نے ظاہری حالت میں اس کو خریداری گمان کیا، تو ظاہر گمان کے مطابق اس لفظ کو جاری کر دیا۔ ضحاک نے کہا: وہ آدمی جس نے آپ کو خریدا وہ مصر کا بادشاہ تھا اور اس کا لقب عزیز ہے۔ سہیلی نے کہا: اس کا نام قطفیر ہے ابن اسحاق نے کہا: اطفیر بن روحیب نے اپنی بیوی راعیل کے لیے اسے خریدا (1)۔ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس کا نام زلیخا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عزیز (مصر) کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ڈال دی تھی تو اس نے اس کی وصیت اپنے اہل خانہ کو کی۔ اس بات کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اس (عزیز مصر کی بیوی) کے نام کے بارے میں ثعلبی وغیرہ نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کو مصر کے بادشاہ کے وزیر قطفیر نے خریدا اور وہ ریان بن ولید تھا (2)۔ ایک قول کے مطابق: ولید بن ریان اور یہ عمالقہ کا ایک آدمی تھا، جبکہ ایک قول کے مطابق: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک قول کی وجہ سے کہ: وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ (غافر: 34) اور اس نے چار سو سال زندگی گزاری۔ ایک قول یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کی اولاد میں سے تھا جس طرح کہ اس کا بیان سورۂ غافر میں آئے گا اور یہ عزیز جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کے خزانوں پر (نگرانی کے لیے) خریدا اس نے مالک بن دعر سے حضرت یوسف کو بیس دینار کے عوض خریدا اور اس کے ساتھ ایک حلہ اور نعلین زائد دیے۔ ایک قول یہ ہے: اس نے آپ کو قافلہ والوں سے خریدا۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کی قیمت میں اتنی زیادتی کر لی کہ آپ کے وزن کے دوگنا وزن کے برابر مسک، عنبر، ریشم، چاندی، سونا، موتی اور جواہر تھے جنکی قیمت سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ قطفیر نے مالک بن دعر سے اس قیمت کے عوض آپ کو خرید لیا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ وہب نے اس کے علاوہ بھی ایک بات کی ہے: جب مالک بن دعر نے حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں سے خریدا تو ان کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا: یہ جس کو مالک بن دعر نے بنی یعقوب میں سے بیس درہم کے عوض خریدا ہے اور وہ فلاں فلاں ہیں ان کا غلام ہے۔ اور انہوں نے یہ شرط رکھی کہ یہ بھاگا ہوا ہے اور یہ اس کو بغیر قید اور بیڑیوں کے نہیں رکھے گا اور اس نے ان کو اس بات پر اللہ تعالیٰ کا عہد دیا۔ اس نے کہا: اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں الوداع کہا اور آپ کہہ رہے تھے: اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے اگرچہ تم نے مجھے ضائع کر دیا، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے اگرچہ تم نے مجھے رسوا کیا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم کرے اگرچہ تم نے میرے اوپر رحم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: اس الوداع کی شدت کے سبب ریوڑ نے اپنے پیٹوں میں موجود تازہ خون باہر پھینک دیا۔ انہوں نے آپ کو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 19

2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 208

اونٹ کے ایسے پالان پر بٹھایا جس پر کوئی فرش اور بچھونا وغیرہ نہیں تھا اور آپ کو قید کر کے بیڑیاں پہنا دیں۔ آپ آل کنعان کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنی ماں کی قبر کو دیکھا اور ایک سیاہ فام حبشی ان کے پہرے پر مامور تھا وہ غافل ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو اپنی والدہ کی قبر پر گرا دیا اور ان کی قبر پر لوٹ پوٹ ہونے لگے اور ان کی قبر سے گلے لگ گئے اور اضطراب سے کہنے لگے: اے میری ماں! سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھ۔ وہ کس طرح زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے انہوں نے میرے والد اور میرے درمیان جدائی ڈال دی ہے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو اپنی رحمت کے مستقر میں جمع کر دے، بے شک وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جب اس حبشی نے حضرت یوسف کو پالان پر نہیں دیکھا تو وہ پیچھے دوڑا تو آپ ایک قبر پر تھے اس نے غور کیا تو وہ آپ ہی تھے تو اس نے اپنے پیر سے خاک پر ٹھوکر ماری اور آپ کو لوٹ پوٹ کر دیا اور آپ کو دردناک مار لگائی، تو آپ نے اسے فرمایا: ایسا مت کرو! اللہ تعالیٰ کی قسم! میں بھاگا ہوا نہیں، جب میں اپنی ماں کی قبر کے پاس سے گزرا تو میں نے چاہا کہ میں اپنی ماں کو الوداع کہوں اور میں ایسا کام دوبارہ نہیں کروں گا جو تم کو ناپسند ہو۔ حبشی نے کہا: اللہ کی قسم! تو بہت برا غلام ہے تو کبھی اپنے باپ کو پکارتا ہے اور کبھی اپنی ماں کو تو نے اپنے مالکوں کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور عرض کی: اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرے یہ کام خطا ہیں تو میں اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما، تب آسمان کے فرشتوں نے چیخ و پکار کی اور حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اے یوسف: اپنی آواز کو پست رکھیں، آپ نے تو آسمان کے فرشتوں کو رلا دیا ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں زمین کو الٹ پلٹ کر دوں اس کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دوں؟ آپ نے فرمایا: اے جبریل ٹھہرو! اللہ تعالیٰ حلیم ہے جلدی نہیں کرتا۔ تو جبریل نے زمین پر اپنا پر مارا تو زمین پر اندھیرا چھا گیا اور گرد و غبار اڑنے لگا اور سورج کو گہن لگ گیا اور قافلہ ایسا تھا کہ کوئی آدمی دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا، قافلہ کے سردار نے کہا: تم میں سے ضرور کسی نے ایسا کام کیا ہے جو پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ میں اتنے لمبے عرصہ سے اس علاقہ میں سفر کر رہا ہوں، اور میرے ساتھ کبھی اس قسم کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ تو اس حبشی نے کہا: میں نے اس عبرانی غلام کو تھپڑ مارا تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کچھ ایسا کلام کیا جس کو میں نہیں جانتا، کوئی شک نہیں کہ اس نے ہمارے خلاف دعا کی۔ سردار نے ان سے کہا: تو نے ہمیں ہلاک کرنا چاہا، اس (غلام) کو ہمارے پاس لاؤ۔ وہ آپ کو لایا، سردار نے آپ کو کہا: اے لڑکے! اس نے تم کو تھپڑ مارا جس کے نتیجہ میں ہم پر وہ عذاب آیا جس کو تم نے دیکھا، اگر تم بدلہ لینا چاہو تو تم جس سے چاہو بدلہ لے لو اور اگر تم معاف کر دو تو تم سے یہی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس امید پر اس کو معاف کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا تو گرد و غبار چھٹ گیا اور سورج ظاہر ہو گیا اور مشرق و مغرب میں روشنی پھیل گئی اور وہ تاجر صبح شام آپ کی زیارت کرنے لگا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرنے لگا یہاں تک کہ آپ مصر پہنچ گئے اور آپ نے دریائے نیل میں غسل کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے سفر کی تھکاوٹ دور کر دی اور آپ کا حسن و جمال لوٹا دیا وہ سردار آپ کو دن کے وقت لے کر شہر میں داخل ہوا اس حال میں کہ آپ کے چہرے

کا نور شہر کی دیواروں میں پڑ رہا تھا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے لیے پیش کیا تو بادشاہ کے وزیر قطفیر نے آپ کو خرید لیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بادشاہ مرنے سے پہلے آپ پر ایمان لے آیا تھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کی پھر جن دنوں میں حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے خزانوں پر مامور تھے وہ بادشاہ مر گیا تو اس کے بعد قابوس بادشاہ بنا، وہ کافر تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے اس کا انکار کر دیا۔ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ یعنی اس کی منزل اور اس کے مقام کو کھانے اور اچھے لباس کی عمدگی کے ذریعے۔ یہ ثوی بالمکان سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے أقام بہ سورۂ آل عمران وغیرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ یعنی جب بالغ ہوگا تو ہماری مہمات میں ہمیں کافی ہوگا۔ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ نامرد تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی، اسی طرح امام ابن اسحاق نے کہا: قطفیر عورتوں کی مقاربت نہیں کرتا تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی۔

اگر یہ کہا جائے: اس نے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا کیسے کہہ دیا حالانکہ وہ بادشاہ تھا اور غلامی کے ساتھ اسے بیٹا بنانا تو دو متضاد چیزیں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا: وہ اسے آزاد کرے گا اور پھر منہ بولا بیٹا بنالے گا اور منہ بولا بیٹا بنانا ان کے ہاں ایک مروج اور معلوم امر تھا۔ اور اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہ عام تھا جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: فراست کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے اچھے تین آدمی تھے (1)۔ ایک عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے سعادت کے آثار بھانپ لیے اور کہا: عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا شاید یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں۔ (دوسری) حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شرافت کے آثار دیکھ کر اپنے باپ سے کہا تھا: اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾ (القصص) اے ابا جان! آپ انہیں اجرت پر رکھ لیں۔ بے شک جن کو آپ اجرت پر رکھیں ان میں بہترین شخص وہ ہے جو طاقتور اور ایماندار ہو (تیسرے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ابن عربی نے کہا: اس خبر کو نقل کرنے پر اتفاق کر لینے میں مفسرین پر تعجب ہے (2) فراست عجیب وغریب علم ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ "الحجر" میں آئے گا اور ان کی نقل کردہ اس بات میں، یہ یوں نہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا والی بنایا تو یہ اعمال میں تجربہ، محبت میں مواظبت اور طوالت، اور ان کی طرف سے علم واحسان کا مشاہدہ کر لینے کے بعد تھا اور یہ فراست کے طریقہ پر نہیں ہے، جہاں تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا تعلق ہے تو اس کے پاس بھی واضح علامات موجود تھیں جس طرح کہ سورۃ القصص میں آئے گا، البتہ عزیز مصر کے معاملہ کو فراست بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی ظاہری علامت نہیں تھی۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ کاف ضمیر محل نصب میں ہے، یعنی جس طرح ہم نے اس (یوسف) کو اس کے بھائیوں سے اور کنویں سے نکالا اسی طرح ہم نے اسے قرار بخشا؛ یعنی وہ بادشاہ جس نے اسے خریدا اس کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1080 2۔ ایضاً

دل ہم نے اس پر مہربان کر دیا یہاں تک کہ وہ بادشاہ کی حکومت والے شہر میں امر اور نہی پر قادر ہو گیا۔ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ہم نے اسے قرار بخشا تا کہ ہم اپنی طرف سے کلام کے ذریعے اس کی طرف وحی کریں اور اسے اس کی تاویل و تفسیر سکھا دیں اور خوابوں کی تعبیر اور کلام کی اتمام سکھا دیں۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں بلکہ وہ خود اپنے امر پر غالب ہے جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کہہ دیتا ہے: ہو جا، پس ہو جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ یوسف کے معاملہ پر غالب ہے اس کی تدبیر کرتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو کسی اور کے سپرد نہیں کرتا یہاں تک کہ اس تک کوئی فرد بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اس کے غیب پر مطلع نہیں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اَكْثَرَ سے مراد تمام لوگ ہیں کیونکہ کوئی بھی (خود بخود) غیب نہیں جانتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ اپنے ظاہر پر جاری ہے، کیونکہ بعض اوقات وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بعض غیب پر مطلع کر دیتا ہے اور ایک قول یہ ہے: وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ کا معنی یہ ہے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے اور وہ مشرک ہیں اور وہ لوگ ہیں جو تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ کے بارے میں حکماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ نے خواب بیان کر دیا، پھر آپ کے بھائیوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ بادشاہ بن گئے اور انہوں نے آپ کے سامنے سجدہ کیا۔ پھر بھائیوں نے چاہا کہ وہ اپنے باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیں تو اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ ان کے باپ کا دل ان کے بارے میں تنگ ہو گیا۔ اور ستر یا اسی سال کے بعد انہوں نے سوچا تو کہا: یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ (یوسف: 84) پھر انہوں نے غور و فکر کیا کہ اس کے بعد وہ نیک لوگ ہو جائیں۔ یعنی توبہ کرنے والے ہو جائیں، پس اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ وہ گناہ بھول گئے اور انہوں نے اس پر اصرار کیا یہاں تک کہ ستر سال کے بعد اس معاملہ کے آخر میں انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اپنے باپ کو کہا: اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ (یوسف) ہم غلطی پر تھے۔ پھر انہوں نے چاہا کہ رونے کے ذریعے اور قمیص کے ذریعے وہ اپنے باپ کو دھوکہ دیں تو اللہ کا امر غالب آیا اور وہ دھوکہ نہ دے سکے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یعنی تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے یہ معاملہ آراستہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کوشش کی کہ اپنے باپ کے دل سے اس (یوسف) کی محبت کو زائل کریں تو اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا اور ان کے دل میں محبت اور شوق اور زیادہ ہو گیا۔ پھر عزیز کی بیوی نے تدبیر کی کہ وہ عزیز مصر سے شکایت کرنے میں پہل کرے گی اور آپ پر غالب آ جائے گی لیکن اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ عزیز مصر نے کہا: وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ اپنے گناہ سے توبہ کرو بیشک تو خطا کاروں میں سے ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کے ذکر کے ذریعے قید خانے سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کی مگر اللہ کا امر غالب آیا ساقی بھول گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کئی سال تک قید خانے میں ٹھہرے رہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝

''اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم اور یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھا کام کرنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ سیبویہ کے نزدیک اَشُدَّهٗ جمع ہے اور اس کا واحد شِدَّةٌ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا واحد شد ہے(1)۔ جس طرح کہ شاعر نے کہا۔

عَهْدِی بِهٖ شَدَّ النَّهارِ كَاَنَّمَا خُضِبَ اللَّبانُ ورأسُه بالعِظْلِمِ

شَدَّ النهار سے مراد دن کا جوبن اور عروج ہے۔

ابو عبید کا گمان ہے کہ عربوں کے نزدیک لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے(2)۔ اور اس کا معنی قوت کا کمال پا لینا ہے پھر اس کے بعد نقصان ہوتا ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: الاشد ''تینتیس سال کی عمر ہے(3)۔ حضرت ربیعہ، حضرت زید بن اسلم اور حضرت مالک بن انس نے کہا: الاشد نوجوان کی بلوغت کی عمر ہے(4)۔ اس سلسلہ میں سورۃ ''النساء'' اور ''انعام'' میں علماء کے مکمل اقوال گزر چکے ہیں۔ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ایک قول یہ ہے: ہم نے اس کو حکومت کا والی بنا دیا۔ اور وہ بادشاہ کی سلطنت میں فیصلہ کرتے تھے ہم نے ان کو فیصلہ کا علم دیا۔ مجاہد نے کہا: (اس سے مراد) عقل، فہم اور نبوت ہے۔ ایک قول یہ ہے: حکم سے مراد نبوت اور علم سے مراد علم دین ہے۔ ایک قول کے مطابق: خواب کی تعبیر کا علم (مراد ہے) اور جس نے کہا: آپ کو بچپن میں نبوت دے دی گئی تھی اس نے کہا کہ جب آپ جوبن کو پہنچے تو ہم نے ان کی سمجھ اور علم میں اضافہ کر دیا۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اس سے مراد مومنین ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مصائب پر صبر کرنے والے ہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ طبری نے کہا: اس آیت کریمہ میں اگرچہ ظاہراً محسن ہوسکتا ہے مگر اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جس طرح میں نے تمام کاروائی کے بعد یوسف کے ساتھ کیا پھر اسے عطا کیا جو کچھ عطا کیا اسی طرح میں آپ کو بھی آپ کی قوم کے ان مشرکوں سے نجات دوں گا جو آپ کے ساتھ دشمنی کا ارادہ رکھتے ہیں اور زمین میں تجھے قرار بخشوں گا۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ۝

''اور بہلانے پھسلانے لگی انہیں وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب براری کرے اور (ایک دن) اس نے تمام دروازے بند کر دیے اور (بصد ناز) کہنے لگی: بس آ بھی جا۔ یوسف (پاکباز) نے فرمایا: خدا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 211
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081

کی پناہ! (یوں نہیں ہوسکتا) وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے بڑی عزت سے ٹھیرایا ہے۔ بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے اور اس عورت نے تو قصد کر لیا تھا ان کا اور وہ بھی قصد کرتے اس کا اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی (روشن) دلیل، یوں ہوا تاکہ ہم دور کر دیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کو، بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو چن لیے گئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وہ عزیز مصر کی بیوی ہے(1) اس نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ اس سے مطلب براری کریں۔ المراودۃ کی اصل نرمی اور مہربانی کیساتھ ارادہ اور طلب ہے۔ اور الرود اور الریاد سے مراد کسی چیز کو بار بار طلب کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ روید سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یمشی رویدا یعنی فلاں نرمی سے چلتا ہے۔ مراودۃ سے مراد طلب میں نرمی ہے۔ مرد کے بارے میں کہا جاتا ہے: راودھا عن نفسھا اور عورت کے بارے میں: راودته عن نفسه اور الرود سے مراد التأنی ہے۔ کہا جاتا ہے: أرودنی یعنی اس نے مجھے مہلت دی۔ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ غلق کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ غلق الباب نہیں کہا جاتا۔ جبکہ اغلق کثیر و قلیل دونوں کے لیے آتا ہے، جس طرح فرزدق نے ابوعمرو بن العلاء کے بارے میں کہا:

مازلتُ أُغلق أبوابًا و أفتحُهَا حتى أتيتُ أبا عمر وبن عمّارِ

میں دروازے بند کرتا رہا اور انہیں کھولتا رہا یہاں تک کہ میں ابوعمرو بن عمار کے پاس پہنچ گیا۔

اس میں أغلق کئی دروازوں کے لیے استعمال ہوا۔

کہا جاتا ہے: وہ سات دروازے تھے اس نے ان کو بند کر دیا پھر آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ یعنی هلم أقبل اور تعال آگے بڑھو۔ اس کا نہ کوئی مصدر ہے اور نہ ہی اس کی کوئی گردان ہوسکتی ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں سات قرائتیں جائز ہیں۔ اس سلسلہ میں ازروئے اسناد کے صحیح وہ ہے جسے اعمش نے ابی وائل سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو هَيْتَ لَكَ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے کہا: تو میں نے کہا: بعض لوگ اس کو هِيتَ لك پڑھتے ہیں تو آپ (حضرت عبداللہ بن مسعود) نے کہا: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا ہے(2)۔ ابوجعفر نے کہا: بعض لوگ عن عبداللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں، کیونکہ ان کا قول: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔ اور یہ قرأت تا اور ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے یہی حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد اور عکرمہ کی قرأت میں سے صحیح قرأت ہے اور یہی ابوعمرو بن علاء، عاصم، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں تقطیع نہ کرو؛ پس یہ تمہارے قول هلم اور تعال کی طرح ہے۔ ابن ابی اسحاق نحوی نے قالت هَيْتِ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے فتحہ اور تا کے کسرہ کے ساتھ۔

طرفہ نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقرءات، حدیث نمبر 3491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لیس قومي بالأبعدين إذا ما قال داعٍ من العشيرة هَيتُ(1)

طرفہ کے اس شعر میں محل استشہاد هَيتُ ہے اس میں ھا کے فتحہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

پس یہ تین قراءتیں ہیں ان میں ھا مفتوح ہے۔ ابوجعفر، شیبہ اور نافع نے وَقَالَتْ هِيْتَ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ۔ یحییٰ بن وثاب نے وَقَالَتْ هِيْتُ لَكَ پڑھا ہے ھا کے کسرہ اس کے بعد ساکن اور تا مضموم کے ساتھ۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور عکرمہ سے وَقَالَتْ هِئْتُ لَكَ روایت ہے۔ ھا کے کسرہ کے بعد ہمزہ ساکن اور تا مضمومہ کے ساتھ۔ ابن عامر اور اہل شام سے وَقَالَتْ هِئْتَ منقول ہے ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ؛ ابو جعفر نے کہا: هيتَ لَكَ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا کے فتحہ کیساتھ کیونکہ یہ ایک آواز ہے جس طرح مهٍ اور صهٍ وغیرہ ضروری ہے کہ یہ معرب نہ ہو۔ اور فتحہ خفیف حرکت ہے کیونکہ تا سے پہلے یا ہے جیسے اینَ اور کیفَ اور جس نے تا کو کسرہ دیا اس نے اس وجہ سے اس کو کسرہ دیا کیونکہ اصل کسرہ ہی ہے کیونکہ ساکن کو جب حرکت دی جائے تو کسرہ کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے۔ اور جس نے ضمہ دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غایت کا معنی پایا جاتا ہے؛ یعنی اس (عورت) نے کہا: تیرے لیے میری پکار۔ جب اضافت کو حذف کیا گیا تو اس کو مبنی بر ضمہ پڑھا گیا ہے، جیسے حیثُ اور بعدُ وغیرہ۔ اس کے بارے میں اہل مدینہ کی قرأت کے دو قول ہیں: ایک التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ فعل ہو هَاءَ يَهِيءُ جیسے جاء یجیء پس هِئْتَ کی صورت میں معنی ہو گا حسنت هيئتك یعنی تیری ہیئت عمدہ ہے اور لك الگ کلام ہو گا جس طرح آپ کہتے ہیں! لكَ أعني اور جس نے ہمزہ اور تا کا ضمہ پڑھا تو اس صورت میں یہ فعل ہو گا تهيأت لك کے معنی میں ہو گا۔ اسی طرح جس نے هِئْتُ لَكَ پڑھا۔ اور ابو عمرو نے اس قراءت کا انکار کیا ہے۔ ابو عبیدہ۔ معمر بن المثنی نے کہا: ابو عمرو سے اس آدمی کی قرأت کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ھا کے کسرہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ اس کو مہموز پڑھا تو ابو عمرو نے کہا: باطل ہے۔ اس نے اس کو تهيأت سے بنایا ہے! جا پورے عرب سے تعرض کر یہاں تک کہ یمن تک پہنچ جا کیا تو کسی ایک آدمی کو بھی پہچان لے گا جو یوں کہے؟ کسائی نے بھی کہا: هِئْتُ عربوں سے حکایت نہیں کیا گیا۔ عکرمہ نے کہا: هِئْتُ لَكَ یعنی تهيأت لك و تزينت و تحسنت، اور یہ ناپسندیدہ قرأت ہے، کیونکہ یہ عربی میں سنی ہی نہیں گئی۔ نحاس نے کہا: یہ بصریوں کے نزدیک عمدہ ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: هَاءَ الرجل يَهاء ويَهِيءُ هيأة پس هاء يهيء، جاء يجيء کی طرح ہے اور هِئْتُ جئت کی طرح ہے۔ اور هيت میں ھا کا کسرہ ایسے لوگوں کی قرأت ہے جو ھا کے فتحہ پر اس کے کسرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عمدہ ترین قرأت هَيْتَ لك ھا اور تا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ طرفہ نے کہا:

لیس قومي بالأبعدين إذا ما قال داعٍ من العشيرة هَيتَ(2)

اس شعر میں طرفہ نے هيت ھا اور تا کے فتحہ کیساتھ ہی پڑھا ہے۔

شاعر نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 216 2۔ ایضاً

أَبلغْ أمير المؤمنينَ أخا العراقِ إذا أتيتَا

إنّ العراقَ وأهلَهُ سِلمٌ إليك فَهَيْتَ هَيْتَا (1)

اس شعر میں بھی هَیْتَ ہی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رحمہما اللہ نے کہا: هیت یہ سریانی زبان کا کلمہ ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں۔ سدی نے کہا قبطی زبان میں اس کا معنی هلم لك ہے۔ ابوعبید نے کہا: کسائی کہا کرتا تھا: یہ اہل حوران کی لغت ہے۔ جو اہل حجاز میں آ گئی اس کا معنی تعال ہے۔ ابوعبید نے کہا: حوران کے ایک بوڑھے عالم سے میں نے پوچھا تو اس نے ذکر کیا کہ یہ ان کی لغت ہے۔ یہ عکرمہ نے بھی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ عربی لغت ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں اور یہ اشیاء پر آنے اور ابھارنے کا کلمہ ہے۔ جوہری نے کہا: جب کوئی آدمی چیخے اور کسی کو بلائے تو اس وقت هَوَّتَ بہ اور هَیَّتَ بہ کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا:

قد رَابَنِی أَنَّ الکَرِیَّ أَسْکَتَا لو کان مَعْنِیا بها لَهَیَّتَا

جوہری نے هیت کے ثبوت پر یہ شعر پڑھا جس میں لھیتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ وہ چیختا، دوسرے نے کہا:

یَحْدُو بها کُلُّ فتیً هَیَّاتِ

اس مصرعہ میں بھی هیات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور جس طرف تو نے مجھے بلایا ہے اس سے اللہ کی امان طلب کرتا ہوں۔ یہ مصدر ہے یعنی أعوذ باللہ معاذاً، فعل کو حذف کر دیا گیا ہے اور فعل محذوف کے سبب مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: مررتُ بزیدٍ مرور عمرو یعنی مروری بعمرو۔ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ یعنی اس (عورت) کا شوہر یعنی وہ میرا سردار ہے اس نے میری تکریم کی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کروں گا۔ یہ سدی، ابن اسحاق اور مجاہد کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک اللہ میرا رب ہے اس نے اپنی مہربانی سے مجھے والی بنایا، پس میں اس کام کا ارتکاب نہیں کروں گا جس کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ حدیث میں ہے (2) کہ اس نے آپ کو کہا: اے یوسف! تیرے چہرے کی صورت کتنی خوبصورت ہے! آپ نے جواب دیا: رحم میں میرے پروردگار نے میری تصویر بنائی، اس نے کہا: تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا: میری قبر میں سب سے پہلے مجھ سے جدا ہوں گے۔ اس نے کہا: اے یوسف! تیری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا ان کے ساتھ میں اپنے پروردگار کو دیکھوں گا۔ اس نے کہا: اے یوسف! اپنی نگاہ کو اٹھاؤ اور میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ آپ نے جواب دیا: میں اپنی آخرت میں اندھا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں تیرے قریب ہوتی ہوں اور تو مجھ سے دور ہوتا ہے۔ آپ نے کہا: میں اس طریقے سے اپنے پروردگار کا قرب چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں نے تیری خاطر علیحدہ کمرہ بنا دیا ہے پس میرے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ آپ نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 218

فرمایا: کمرہ مجھے میرے پروردگار سے نہیں چھپا سکتا۔ اس نے کہا: اے یوسف! ریشم کا بستر میں نے تیری خاطر بچھا دیا ہے۔ اٹھو اور میری حاجت پوری کرو۔ آپ نے فرمایا: تب تو جنت میں سے میرا حصہ جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے گفتگو کی اور آپ اس کا جواب دیتے رہے یہاں تک کے آپ اس کی طرف مائل ہوئے (٭)۔ بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف شہوت کے ساتھ مائل ہوتی رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبوت کی ہیبت ڈال دی بعد ازاں جس نے بھی آپ کو دیکھا اس کو اس ہیبت نے آپ کے حسن سے مشغول رکھا۔ آپ کے ھم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس عورت کا ھم نافرمانی تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لیکن جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھ لیا تو آپ نے قصد نہ کیا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ عصمت انبیاء لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ھم بھا ہے

ابو حاتم نے کہا: میں غریب القرآن ابو عبیدہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا جب میں وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا پر پہنچا تو ابو عبیدہ نے کہا: اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ گویا کہ وہ یہ مراد لے رہے تھے کہ لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ھم بھا اگر آپ اپنے رب کی طرف سے (روشن) دلیل نہ دیکھ لیتے تو آپ بھی ضرور اس کا قصد کرتے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یعنی زلیخا نے نافرمانی کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اس پر مصر تھی اور حضرت یوسف مائل ہوئے مگر جس طرف آپ مائل ہوئے اس میں واقع نہیں ہوئے لہٰذا دونوں کے ارادے میں فرق ہے۔ یہ دونوں قول ہروی نے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ جمیل نے کہا:

هَمَمْتُ بِهَمٍّ من بُثَيْنَةَ لو بَدَا　　شَفيتُ غَلِيلاتِ الهوى من فُؤَادِيَا

دوسرا

هَمَمْتُ ولم أفعلْ وكدتُ وليتني　　تركتُ على عثمان تبكي حلائلُه

یہ ساری نفس کی گفتگو ہے بغیر عزم کے۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اس کی زوجیت کا قصد کیا۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد ہے آپ نے اس کو مارنے اور اپنے آپ سے دور کرنے کا قصد کیا اور رب کی دلیل نے مارنے سے روک لیا، کیونکہ اگر آپ اس کو مارتے تو یہ وہم پیدا ہو جاتا کہ آپ نے حرام کا قصد کیا اور اس نے اس سے روک دیا پس اس وجہ سے آپ نے اسے مارا۔ اور ایک قول یہ ہے: یوسف کا قصد بھی معصیت تھا اور وہ اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ اس قول کی طرف اکثر و عام مفسرین مائل ہوئے ہیں۔ جن میں سے قشیری ابو نصر، ابن الانباری، نحاس اور ماوردی وغیرہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ نے سروال کا بندھن کھولا اور اس کے پاس

٭ روایت کے آخری الفاظ کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف: 24) یعنی برہان کے پائے جانے کی وجہ سے آپ کے ارادہ کا پایا جانا ممتنع ہے۔

ختنہ کرنے والے کے بیٹھنے کی طرح بیٹھے (1)۔ آپ سے ہی روایت ہے: وہ (زلیخا) اپنی گدیوں پر چت لیٹی اور آپ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھے اور آپ نے اپنے کپڑے اتارے، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے اپنی سروال کا بندھن کھولا (2)۔ مجاہد نے کہا: آپ نے سروال کو کھولا یہاں تک کہ آپ الیتین تک پہنچ گئے اور اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اور جب آپ نے کہا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (یوسف: 52) یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ جان لے کہ میں نے چھپ کر خیانت نہیں کی۔ تو جبریل نے آپ کو کہا: اور نہ ہی اس وقت جب آپ نے قصد کیا تھا اے یوسف علیہ السلام؟ تو اس وقت آپ نے فرمایا: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (یوسف: 53) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا۔ مفسرین نے کہا: اس حالت میں (غلط کاری سے) رک جانا اخلاص پر دلالت کرتا ہے اور ثواب کے حصول کے لیے بہت بڑا کام ہے (☆)۔

میں (قرطبی) نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو حضرت ذوالکفل کی تعریف کی ہے اس کا یہی سبب ہے جس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ص میں آئے گا۔ اس بنیاد پر "لولا" کا جواب محذوف ہے: یعنی اگر آپ نے اپنے رب کی روشن دلیل کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ آپ کر گزرتے جس کا آپ نے قصد کیا تھا۔ اور اسی کی طرح كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ (تکاثر) ہے اور اس کا جواب لن تنافسوا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسلاف کی ایک جماعت سے مروی ہے؛ انہوں نے کہا: اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے لیے مثال بن جائیں تا کہ وہ دیکھیں کہ ان کی توبہ کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کی معافی اور عفو و درگزر ہے جس طرح اس آدمی کی توبہ کا انجام معافی ہوا جو ان سے بہتر ہے (یعنی حضرت یوسف کی توبہ) اور گناہ کے قرب نے ان کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ ساری صورتحال اس صورت میں ہوگی جس طرح اس گروہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد یہاں تک پہنچ گیا کہ آپ زلیخا کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اور ازار بند کو کھولنا شروع کر دیا اور وہ زلیخا ان کے لیے چت لیٹ گئی اس کو طبری نے بیان کیا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا قصد کیا۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کتاب کی تاویل کو زیادہ جانتے ہیں، اسی طرح انبیاء کی بہت زیادہ تعظیم کرنے والے ہیں اور بغیر علم کے ان کے بارے میں گفتگو کرنے والے نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معاصی کو اس لیے ذکر نہیں کیا کہ ان کے ذریعے ان پر عار نہ لگے بلکہ ان کا ذکر اس لیے کیا تا کہ تم توبہ سے مایوس نہ ہو۔ غزنوی نے کہا: انبیاء علیہ السلام کی لغزش میں کئی حکمتیں ہیں، مثلاً خوف کی زیادتی، شرمندگی کی وجہ سے حیاء کی شدت، عجب عمل سے خالی ہو جانا، امید کے بعد عفو و درگزر کی نعمت سے لطف اندوز ہونا اور ان کا لغزش والے لوگوں کی امیدوں کا امام ہونا وغیرہ۔ ابو نصر قشیری نے کہا: ایک قوم نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے قصد کا ظہور ہوا اور ان کا یہ قصد طبعی تھا اور اس میں وہ فعل کرنے کا عزم مصمم نہیں تھا۔ اور جو قصد اس قبیل سے ہو اس کی وجہ سے بندے پر کوئی سزا نہیں ہوتی، جس طرح بعض اوقات ایک روزہ دار کے دل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 219 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 220 ☆ یہ سب روایات قرآن حکیم کی صریح نص کے خلاف ہیں۔

میں ٹھنڈا پانی پینے اور لذیز کھانا کھانے کی سوچ پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اس نے نہ کھایا، نہ پیا اور نہ ہی کھانے پینے کا عزم مصمم کیا تو دل میں پیدا ہونے والے اس کلام کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اب رب کی روشن دلیل نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس قصد سے پھیر دیا تو وہ عزم مصمم نہ رہا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ عمدہ بات ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس آیت کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت یوسف کا نبی ہونا صحیح نہیں اور نہ ہی اس حوالے سے روایات ظاہر ہیں۔ اور اگر معاملہ یوں ہو تو پھر آپ ایک بندہ مومن ہیں آپ کو سلطنت اور علم عطا کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ قصد جو فقط کسی کام کے کرنے کا ارادہ ہے اور اس میں فعل کا وقوع نہیں اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خطا کا دل کے اندر ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اور اگر ہم اس وقت آپ کو نبی فرض کریں تو پھر میرے نزدیک سوائے اس قصد کے جو صرف دل کے اندر کھٹکتا ہے کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔ اس صورت میں جو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنا ازار بند کھولا وغیرہ یہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ نبوت کے ساتھ تو عصمت (لازمی) ہوتی ہے۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ کو کہا گیا: تکون فی دیوان الانبیاء و تفعل فعل السفهاء تو اس کا معنی اس واقعے کے بعد انبیاء میں شمار ہونا ہوگا۔

میں (قرطبی) نے کہا: انہوں نے اس تفصیل میں سے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نبی تھے جس طرح ہم نے ذکر کیا اور یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور آپ نبی تھے تو پھر قصد سے مراد وہ ہوگا جو دل میں کھٹکتا ہے اور سینے میں ثابت نہیں ہوتا؛ اور یہی وہ چیز ہے جس پر مواخذے کو اللہ نے مخلوق سے اٹھا لیا ہے (یعنی وسوسہ) کیونکہ اس کو انسان دور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ (یوسف: 53) اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے۔ لیکن معنی یہ ہے کہ اس قصد سے میرا نفس بری نہیں یا پھر آپ کا یہ قول تواضع اور اعتراف عجز کے طور پر ہوگا کیونکہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاک کیا آپ کا نفس اس کی مخالفت کر رہا تھا؛ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بلوغت کے وقت آپ کے حال کی خبر دی اور ارشاد فرمایا: وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا جس طرح کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی خبر سچی، اس کا وصف صحیح اور حق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے زنا اور اس کے مقدمات کی حرمت، سردار، پڑوسی اور اجنبی کے ساتھ خیانت کی حرمت وغیرہ میں سے جو کچھ سکھایا آپ نے اس پر عمل کیا۔ اور آپ نے عزیز مصر کی بیوی سے اعراض برتا۔ اور اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس سے پیٹھ پھیر لی اور اس سے بھاگے یہ ایسی حکمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص کیا اور حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے مقتضیٰ پر آپ کا عمل تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فرشتوں نے عرض کیا: اے پروردگار! یہ تیرا بندہ ہے جو برائی کرنا چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس کی نگرانی کرو اگر اس نے برائی کی تو اس کی مثل اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو اور اگر اس نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کے حق میں نیکی لکھ دو پس اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1 صفحہ 78

نے صرف میری خاطر برائی کو چھوڑ دیا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کی طرف سے خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "جب میرا بندہ کوئی برائی کرنے کا قصد کرتا ہے اور پھر کرتا نہیں تو میں اس کی نیکی لکھ دیتا ہوں"۔ پس اگر بندہ برائی کا قصد کرے تو اس کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے نہ کہ گناہ۔ صحیح میں ہے: "اللہ تعالیٰ نے میری امت کی دل میں پیدا ہونے والے وسوسے کا گناہ اٹھالیا ہے جب تک کہ بندہ اس پر عمل نہ کرے یا اس کے بارے میں گفتگو نہ کرے"۔ ابن عربی نے کہا: مدینہ السلام میں صوفیاء کے اماموں میں سے کوئی امام تھا جو ابن عطا کے نام سے معروف تھا؛ اس نے ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کی یہاں تک کہ اس نے آپ کی طرف منسوب ناپسندیدہ باتوں سے آپ کی برأت کا تذکرہ کیا؛ اس کی مجلس میں ایک آدمی اٹھا جو تمام لوگوں کے نزدیک مبغوض تھا اس نے کہا: اے شیخ: اے ہمارے سردار: تب تو یوسف نے قصد کیا البتہ اس نے پورا نہ کیا؟ امام نے کہا: ہاں! کیونکہ وہاں (رب کی بارگاہ) سے مہربانی تھی۔ عالم اور متعلم دونوں کی مٹھاس کو دیکھو، سوال کرنے والے کے بارے میں ایک عام آدمی کی ذہانت اور عالم نے جو جواب دیا اس کے اختصار اور مکمل ہونے کو دیکھو؛ اسی وجہ سے علماء صوفیہ نے کہا: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا کے ارشاد کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت وعلم غلبہ شہوت کو جدا کرنے کے لیے دیا تاکہ یہ ان کی عصمت کا سبب اور ذریعہ بن جائے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب اللہ نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کی اس کی وجہ سے ان کی عصمت و برأت پختہ ہوگئی تو جو مصعب بن عثمان نے کہا ہے وہ صحیح نہ ہوا۔ مصعب نے کہا: سلیمان بن یسار لوگوں میں خوبصورت ترین آدمی تھا۔ ایک عورت اس کی مشتاق ہوگئی اور اس عورت نے اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا مگر وہ رک گیا اور اسے نصیحت کی اس عورت نے کہا: اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیری مشہوری کروں گی تو وہ نکلا اور اس نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔ تو اس نے خواب میں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا: آپ یوسف ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں وہ یوسف ہوں جس نے قصد کیا تھا۔ اور تو سلیمان ہے جس نے قصد ہی نہ کیا؟ یہ واقعہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ولایت کا درجہ نبوت کے درجے سے بلند ہو حالانکہ یہ محال ہے۔ اگر ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کرلیں کہ وہ نبی نہیں تھے تو آپ کا درجہ بھی ولایت ہوا۔ پھر تو آپ کو بھی اسی کی طرح محفوظ ہونا چاہیے؛ اور اگر سلیمان پر دروازے بند کر دیے جاتے اور لمبی دیر تک گفتگو اور خطاب کے ذریعے اور کلام وجواب کے ذریعے متوجہ کیا جاتا تو اس پر بھی فتنہ اور بہت بڑے ابتلاء کا اندیشہ ضرور تھا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ، اَنْ محل رفع میں ہے یعنی لولا رویۃ برھان ربہ اگر اپنے رب کی دلیل کی رؤیت نہ ہوتی۔ اور سامع کو معلوم ہونے کی وجہ سے جواب محذوف ہے یعنی لکان ما کان پھر ہوتا جو کچھ بھی ہوتا۔ یہ دلیل قرآن میں مذکور نہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زلیخا گھر کے کونے میں پڑے یاقوت اور جواہرات سے ڈھکے بت کی طرف گئی اور اسے کپڑے کے ساتھ ڈھانپ دیا تو آپ نے کہا: تو کیا کر رہی ہے؟ اس نے کہا: مجھے اپنے اس معبود سے حیاء آتی ہے کہ یہ مجھے اس صورت میں دیکھ لے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ میں اللہ سے حیاء کروں۔ اس سلسلہ میں کی گئی گفتگو میں یہ عمدہ ترین بات ہے کیونکہ اس میں دلیل کا قائم کرنا ہے۔ ایک

قول یہ ہے: آپ نے گھر کی چھت میں وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا ○ (الاسراء) لکھا ہوا دیکھا۔ (اور تم زنا کے قریب مت جاؤ یہ فحش کام ہے اور برا راستہ ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس پر اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ○ (الانفطار) لکھا ہوا تھا۔ (اور بے شک تم پر نگران ہیں) بعض لوگوں نے کہا: آپ نے اللہ تعالیٰ کا عہد اور میثاق یاد کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: ندا دی گئی کہ اے یوسف: آپ کا نام انبیاء علیہم السلام کے دیوان میں لکھا ہوا ہے اور آپ بے وقوفوں کا سا عمل کر رہے ہو؟ ایک قول یہ ہے: آپ نے دیوار پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ان کی انگلیوں کو پکڑ کر دھمکی دے رہے تھے تو آپ رک گئے اور آپ کی انگلیوں سے آپ کی شہوت نکل گئی۔ یہ قتادہ، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، ابو صالح اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعمش نے مجاہد سے روایت کیا: آپ نے اپنی سروال اتاری تو حضرت یعقوب علیہ السلام مثالی صورت میں آپ کے سامنے آئے اور فرمایا: اے یوسف! علیہ السلام تو آپ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سفیان نے ابو حصین سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے سامنے مثالی صورت میں آئے اور آپ کے سینے پر ہاتھ مارا تو آپ کی شہوت آپ کی انگلیوں سے نکل گئی۔ مجاہد نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہر ایک کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے ان کے صرف دو بیٹے پیدا ہوئے اور اس شہوت کی وجہ سے آپ کی اولاد کم ہوئی۔ اس کے علاوہ اقوال بھی ہیں (☆)۔ المختصر: وہ برھان اللہ کی آیات میں ایک آیت تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دکھائی یہاں تک کہ آپ کا ایمان مضبوط ہوا اور نافرمانی سے رک گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ۔ كَذٰلِكَ میں کاف ضمیر محل رفع میں بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی، تقدیر عبارت ہوگی: البراهين كذالك اور یہ مصدر محذوف کی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی أريناه البراهين رؤية كذالك، السُّوْٓءَ سے مراد شہوت ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد مباشرت ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد بری تعریف ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد زنا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد اپنے صاحب سے خیانت کرنا ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد فاحشہ عورت پر سوار ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد عزیز مصر کی سزا ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے الْمُخْلِصِیْنَ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی اطاعت کو خالص کیا، جبکہ قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے چنا ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہ دونوں صفات موجود تھیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مخلص تھے اور اللہ تعالیٰ کی رسالت کے لیے چنے گئے تھے۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

☆ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ ضیاء القرآن میں یہاں امام رازی، ابو حیان اور دوسرے محققین کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں، یہ اقوال آپس میں اتنے متضاد ہیں، ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں کہ انہیں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا نیز یہ کسی مستند روایت سے ان اسلاف سے ثابت نہیں۔

''اور دونوں دوڑ پڑے دروازے کی طرف اور اس عورت نے پھاڑ ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور (اتفاق ایسا ہوا کہ) ان دونوں نے کھڑا پایا اس کے خاوند کو دروازے کے پاس۔ جھٹ بول اٹھی: (میرے سرتاج! بتایئے) کیا سزا ہے اس کی جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا بجز اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے یا (اسے) دردناک عذاب دیا جائے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاسْتَبَقَا الْبَابَ کے بارے میں علماء نے کہا: یہ قرآن معجز کے ان اختصارات میں سے ہے جن میں بہت سے معانی جمع ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھا تو اس عورت سے بھاگے تو دونوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اس لیے دوڑی تاکہ آپ کو اپنی طرف واپس لوٹا لے اور آپ اس لیے تیز دوڑے کہ اس سے بھاگ جائیں تو اس نے آپ کے نکلنے سے پہلے آپ کو پا لیا۔ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ اور اس عورت نے پیچھے سے آپ کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ مِنْ دُبُرٍ، مراد من خلفه، ہے۔ اس نے قمیص کو اوپر سے پکڑا(1) تو قمیص گردن کے پاس سے پھٹی اور وہ پھٹن قمیص کے نیچے تک پہنچ گئی الاستباق سے مراد کسی چیز کی طرف سبقت کو طلب کرنا ہے، اسی سے سباق ہے اور قد سے مراد کاٹنا ہے اور اکثر طور پر لمبائی میں کاٹنے کے لیے یہ استعمال ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

تَقُدُّ السَّلُوْقِيَّ الْمُضَاعَفَ نَسْجُهٗ　　وَتُوْقِدُ بِالصُّفَّاحِ نَارَ الْحُبَاحِبِ

محل استشہاد تَقُدُّ ہے یعنی قَدَّ یَقُدُّ سے جس کا معنی ہے کاٹنا۔

جبکہ القط طاء کے ساتھ چوڑائی میں کاٹنے کیلئے استعمال ہوتا ہے مفضل بن حرب نے کہا: میں نے ایک مصحف میں فَلَمَّا رَاٰی قَمِيْصَهٗ عُطَّ مِنْ دُبُرٍ پڑھا ہے عط کا معنی ہے پھٹنا۔ یعقوب نے کہا: القط سے مراد صحیح جلد اور صحیح کپڑے میں پھٹن ہے۔

اسْتَبَقَا میں الف اور اس کے بعد لام کے ساکن ہونے کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح تثنیہ کی صورت میں جاءنی عبد اللہ کہا جاتا ہے۔ اور عربوں میں جاءنی عبداللہ بھی کہتے ہیں یعنی بغیر ہمزہ کے الف کو ثابت کر کے دونوں ساکنوں کو جمع کرتے ہیں کیونکہ دوسرا مدغم ہے جبکہ پہلا حرف مد ولین ہے۔ اور بعض ''عبداللہ'' کہتے ہیں یعنی الف اور ہمزہ دونوں کو ثابت رکھ کے جس طرح وقف کی صورت میں کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ آیت میں قیاس اور اعتبار پر بھی دلیل ہے اسی طرح عرف وعادت پر عمل کرنے پر بھی دلیل ہے اس کی وجہ قمیص کے آگے اور پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے۔ اور یہ ایسا معاملہ ہے جو صرف مالکیوں کی کتابوں میں ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جب قمیص کو پیچھے سے کھینچا جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور جب سامنے سے کھینچی جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے۔ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ یعنی ان دونوں نے عزیز مصر کو دروازے پر پایا اور سَيِّدَ سے مراد خاوند لیا گیا ہے۔ اور قبطی خاوند کو سید کہتے ہیں اور ألفاه، صادفه، وارطه، اور لاطتمام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جب اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 235

(زلیخا) نے اپنے خاوند کو دیکھا تو بہانہ بنانے کے لیے اس نے اس کی توجہ مبذول کروانا چاہی اور کہنے لگی: قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اس کی کیا سزا ہے جو تیرے گھر والوں کے ساتھ زنا کرنا چاہے؟ سُوْٓءًا سے مراد زنا ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ضرب کی صفت وجیع بیان کی جاتی ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں یضرب ضرب وجیعا اور مَا جَزَآءُ مبتدا ہے اور اَنْ یُّسْجَنَ اس کی خبر ہے۔ جب کہ اَوْ عَذَابٌ، اَنْ یُّسْجَنَ پر معطوف ہے کیونکہ اَنْ یُّسْجَنَ کا معنی الا السجن ہے اس کو عَذَابٌ اَلِیْمٌ پڑھنا بھی جائز ہوگا اس صورت میں عبارت ہوگی او یعذب عذابا الیما یہ کسائی کا قول ہے۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَ اسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ﴿۲۹﴾

"آپ نے (جوابا) فرمایا: (میں نے نہیں بلکہ) اس نے بہلانا چاہا ہے مجھے کہ مطلب براری کرے اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا (کہ دیکھو) اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے سچ کہا، وہ جھوٹوں میں سے ہے اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہوئی ہو پیچھے سے تو پھر اس نے جھوٹ کہا اور یوسف سچوں میں سے ہے، پس جب عزیز نے دیکھا پیراہن یوسف کو کہ پھٹا ہوا ہے پیچھے سے تو بول اٹھا: یہ سب تم عورتوں کا فریب ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے۔ اے یوسف! (پاکباز) اس بات کو جانے دو اور (اے عورت) اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی قصورواروں میں سے ہے"۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا: جب اس عورت نے اپنے آپ کی برأت ظاہر کردی تو پتہ چلا وہ محبت میں سچی نہ تھی کیونکہ محب کی شان تو محبوب کو ترجیح دینا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے بہتان اور جھوٹ کے مقابلے میں سچ بیان کیا۔ نوف شامی وغیرہ نے کہا ہے: گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس واقعہ سے پردہ نہ اٹھایا اور جب اس نے آپ سے بغاوت کی تو آپ کو غصہ آیا اور آپ نے سچ کہہ دیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا کیونکہ جب ان دونوں کے قول میں تعارض واقع ہوا تو بادشاہ کو گواہ کی ضرورت پڑی تاکہ وہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کر سکے تو اس عورت کے گھر کے آدمی نے گواہی دی یعنی اس کے گھر کے آدمی نے فیصلہ کر دیا، کیونکہ یہ اس کی طرف سے فیصلہ تھا نہ کہ شہادت۔ اس گواہ کے بارے میں چار مختلف اقوال ہیں۔ پہلا: وہ بچہ تھا (1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

گود میں اس نے کلام کیا۔ سہیلی نے کہا: یہ صحیح ہے۔ اس حدیث طیبہ کی وجہ سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لم یتکلم فی المھد الا ثلاثۃ(1) گود میں سوائے تین بچوں کے اور کسی نے کلام نہیں کیا۔ ان میں آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر بھی فرمایا۔ ابونصر قشیری نے کہا: اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گھر میں گود میں ایک بچہ تھا اور وہ زلیخا کی خالہ کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''بچپنے میں چار نے کلام کیا'' (2)۔ اور آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی ایک قول ہے۔ دوسرا: کہ گواہ اصل میں قمیص کا پھٹنا تھا۔ اس کو ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے۔ اور یہ لغوی اعتبار سے صحیح مجاز ہے۔ کیونکہ زبان حال زبان مقال کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتی ہے اور بعض اوقات عرب کلام کو جمادات کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کی صفات کی خود اسی کے بارے میں خبر دیتے ہیں اور یہ ان کے اشعار اور کلام میں بہت زیادہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی کا بڑا خوبصورت قول ہے: دیوار نے کیل کو کہا کہ تو نے مجھے کیوں چیرا؟ اس نے اسے کہا: اس سے پوچھ اس نے مجھے کیوں گاڑا؟ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا اس کے قمیص ہونے کو باطل قرار دے دیتا ہے۔

تیسرا: وہ اللہ کی مخلوق میں سے مخلوق ہے نہ تو انسان، نہ ہی جن۔ یہ بھی مجاہد کا قول ہے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا رد کر دیتا ہے۔

چوتھا: وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا۔ وزیر اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لیتا تھا اور وہ عورت کے اہل میں سے تھا اور رہتا اس کے خاوند کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا: میں نے دروازے کے پیچھے سے کھنچنے، خود کر ترجیح دینے اور قمیص کے پھٹنے کے بارے میں سنا یہ معلوم نہیں کہ تم میں سے کون آگے تھا؟ پس اگر قمیص کی پھٹن اس (یوسف) (3) کے آگے کی طرف سے ہے تو تو سچی ہے اور وہ اس کے پیچھے سے ہے تو پھر وہ سچا ہے۔ پھر ان سب نے قمیص کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ حضرت حسن بصری، عکرمہ، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ سدی نے کہا: یہ اس کے چچا کا بیٹا تھا اور اس نے یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس باب میں یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسرائیل عن سماک عن عکرمہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ داڑھی والا آدمی تھا۔ سفیان عن جابر عن ابن ابی ملیکہ عن ابن عباس کہا کہ آپ نے فرمایا: وہ بادشاہ کے خاص آدمیوں میں سے تھا۔ عکرمہ نے کہا: وہ بچہ نہیں تھا البتہ ایک حکیم آدمی تھا۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے: وہ ایک آدمی تھا۔ ابوجعفر نحاس نے کہا کہ وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا بادشاہ نے اس سے مشورہ لیا تو اس نے یہ دلیل پیش کی؟ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کی شہادت تو عادت کو بطور دلیل پیش کرنے سے مستغنی کر دیتی کیونکہ بچے کا کلام کرنا تو معجزہ و کرامت ہے اور یہ عادت سے استدلال کرنے کی نسبت زیادہ واضح تھا۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ تکلم أربعة وهم صغار، منهم صاحب یوسف، (4) کے مخالف بھی نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 489
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 233
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084

کیونکہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صغیر تھا، بوڑھا نہ تھا۔ اور اس سلسلے میں ایک اور دلیل بھی ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے اور یہ روایت بھی متواتر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ بچہ نہیں تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن جبیر، ہلال بن یساف اور ضحاک سے روایت ہے کہ وہ بچہ تھا گود میں۔ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کا صرف کلام کر دینا ہی دلیل ہوتا اور قمیص کے ذریعے استدلال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور اس صورت میں یہ خلاف عادت اور معجزہ کی ایک قسم بنتی۔ واللہ اعلم، ان شاء اللہ سورۂ ''البروج'' میں ان بچوں کا بیان آئے گا جنہوں نے پنگھوڑے میں گفتگو کی۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب ہم یہ بات کہیں کہ وہ شاید چھوٹا بچہ تھا تو اس میں نشانیوں پر عمل کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ بڑا آدمی ہو تو پھر لقطہ اور بہت سے مقامات پر علامت کے ذریعے کیے جانے والے فیصلہ کا حجت ہونا صحیح ہو جائے گا۔

حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے چوروں کے بارے میں کہا: جب ان کے پاس سامان ہو اور بہت سارے لوگ آ کر اس کا دعویٰ کر دیں جب کہ ان کے پاس کوئی بینہ نہ ہو تو سلطان اس سلسلہ میں غور و فکر اور تدبر کرے گا اور اگر ان کے علاوہ دیگر لوگ نہ آئیں تو وہ سامان وہ ان کے سپرد کر دے گا۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر گھر کے سامان میں مرد اور عورت کا اختلاف ہو گیا تو وہ مال جو مردوں کا ہو سکتا ہے وہ مرد کا ہوگا اور جو عورتوں کا ہو سکتا ہے وہ عورتوں کا ہوگا اور جو مرد اور عورت دونوں کا ہو سکتا ہے وہ مرد کا ہوگا۔ شریح قاضی اور ایاس بن معاویہ فیصلہ کے سلسلہ میں علامات پر ہی عمل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں دلیل یہی آیت ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ، كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ اور نحوی اعتبار سے اس میں اشکال ہیں کیونکہ حرف شرط ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں لیکن یہ قانون كَانَ میں جاری نہیں ہوتا۔ مبرد محمد بن یزید نے کہا: یہ کان میں پائی جانے والی قوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعے تمام افعال کو تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: اِنْ كَانَ کا معنی ان یکن ہے یعنی ان یعلم اگر پتہ چل جائے اور علم کا وقوع ہوا نہیں (کہ اسے ماضی کہیں) تو اسی طرح کون (کا وقوع بھی نہیں ہوا) کیونکہ یہ علم کی طرف لے جاتا ہے۔

قُدَّ مِنْ قُبُلٍ یہ فعل ماضی کے ذریعے كَانَ کے بارے میں خبر ہے۔

جس طرح زہیر نے کہا:

وكان طَوَى كَشْحًا على مُسْتَكِنَّةٍ   فلا هو أبداهَا ولم يَتَقدَّمِ

اس شعر میں فلا ھو أبداھا ولم یَتَقدَّمِ ماضی ہے جو کہ کان کی خبر ہے۔

یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق نے مِنْ قُبُلٍ قاف، با اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح دُبُرٍ۔ زجاج نے کہا: ان دونوں کو غایت بنایا جائے گا جس طرح قبل اور بعد۔ گویا کہ اس نے کہا: من قبله و من دبره (1)۔ اور جب مضاف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

الیہ کو حذف کر دیا گیا جو مراد تھا تو مضاف خود اپنی غایت بن گیا اس کے بعد کہ مضاف الیہ اس کی غایت تھی۔ اور غیر مضاف کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے مِنْ قُبُلِ اور مِنْ دُبُرِ یعنی لام اور را کے فتحہ کا ساتھ بھی جائز ہے۔ اور محبوب نے ابو عمرو سے مِنْ قُبْلِ اور مِنْ دُبْرِ بھی روایت کیا ہے، یعنی مخفف اور مجرور۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر نے زلیخا کو اس کے اس قول مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا کے وقت کہا۔ ایک قول کے مطابق: گواہ نے اسے کہا۔ كَيْد کا معنی مکر اور بہانہ ہے۔ سورۃ ''الانفال'' میں یہ گزر چکا ہے۔ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ اس نے عظیم کہا ان کے فتنہ اور کسی مشکل سے نکلنے کے لیے ان کے حیلہ کے بڑے ہونے کی وجہ سے۔ مقاتل نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے بڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (النساء) اور اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کرو اور اسے چھپاؤ، پھر زلیخا کی طرف اس نے توجہ کی اور کہا: اور تو وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اپنے گناہ کی معافی مانگ یعنی اپنے شوہر سے اپنی غلطی کی معافی مانگ تا کہ وہ مجھے سزا نہ دے۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ اس نے من الخاطئات نہیں کہا کیونکہ اس نے مذکر اور مونث دونوں کے متعلق خبر دینے کا قصد کیا ہے اور مذکر کو اس نے غلبہ دیا ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا: من الناس الخاطئین یا من القوم الخاطئین جیسے انها كانت من قوم كافرين، وكانت من القانتين ایک قول یہ ہے: یوسف کو اَعْرِضْ اور زلیخا کو اسْتَغْفِرِيْ کہنے والا اس کا شوہر تھا۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک: کہ وہ غیرت مند نہیں تھا، اس وجہ سے وہ ساکن رہا اور مصریوں میں سے اکثر میں غیرت موجود نہیں ہے۔

دوسرا: کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی غیرت کو سلب کر لیا اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام پر مہربانی تھی یہاں تک کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا اور اس نے زلیخا کو معاف کر دیا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝

''اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی بہلاتی ہے اپنے (نوجوان) غلام کو تا کہ اس سے مطلب براری کرے، اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی محبت، ہم دیکھ رہی ہیں اسے کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ پس جب

زلیخا نے سنا ان کی مکارانہ باتوں کو تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور تیار کیں ان کے لیے مسندیں اور (جب وہ آ گئیں تو) دیدی ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری اور یوسف کو کہا کہ (ذرا) نکل (تو) آ ؤ ان کے سامنے۔ پس جب (یوسف آئے اور) انہوں نے اس کو دیکھا تو اس کی عظمت (حسن) کی قائل ہو گئیں اور (وارفتگی کے عالم میں) کاٹ بیٹھیں اپنے ہاتھوں کو اور کہہ اٹھیں: سبحان اللہ! یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ زلیخا (فاتحانہ انداز میں) بولی: یہ ہے وہ (پیکر رعنائی) جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں بخدا! میں نے اسے بہت بہلایا پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ نہ بجالایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں''۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ، نِسْوَةٌ کو نون کے ضمہ کے ساتھ نُسوہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ اعمش، مفضل اور سلمی کی قرأت ہے اس کی جمع کثرت نساء ہے اس کو قالت نسوہ اور **قَالَ نِسْوَةٌ** دونوں طرح پڑھنا جائز ہے جیسے قالت الاعراب اور قال الاعراب یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اہل مصر میں یہ قصہ مشہور ہو گیا اور عورتوں نے گفتگو کی۔ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کے ساقی کی بیوی تھی، اس کے نان بائی کی بیوی تھی، اس کے قیدی ساتھی کی بیوی تھی وغیرہ۔ ایک قول یہ ہے: حاجب کی بیوی تھی یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ **تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ** کلام عرب میں الفتی نوجوان کو کہتے ہیں جبکہ عورت فتاۃ کہلاتی ہے **قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا** ایک قول کے مطابق: **شَغَفَهَا** سے مراد ہے غلبہا جبکہ ایک قول یہ ہے: اس کی محبت اس کے اندر داخل ہو گئی (1)۔ مجاہد وغیرہ سے منقول ہے عمرو بن دینار نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اس کے دل کی تہہ میں محبت داخل ہو گئی۔ حسن بصری نے کہا الشغف دل کے باطن کو کہتے ہیں۔ سدی اور ابو عبید نے کہا: شغاف القلب سے مراد دل کا غلاف ہے اور اس سے مراد اس کی اوپر والی جلد ہے ایک قول کے مطابق: یہ دل کا درمیانی حصہ ہے۔ ان تمام اقوال کی روشنی میں معنی قریب قریب ہے۔ اور معنی یہ ہوگا: اس کی محبت اس کے شغاف (دل کے باطن) میں داخل ہو گئی پس وہ اس پر غالب آ گئی:

نابغہ نے کہا:

وقد حال ھَمٌّ دون ذالك داخلٌ ۔۔۔ دخولَ الشّغافِ تبتغیه الأصابعُ(2)

ایک قول یہ ہے: شغاف، بیماری ہے۔ اصمعی نے رجز کہنے والے کو کہا:

یتبعھا وھی شَغافُ

ابو جعفر بن محمد بن محیصن اور حسن بصری نے اسے **شَعَفَهَا** عین غیر معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی محبت نے اس (زلیخاء) کے دل کو جلا دیا اور اس نے کہا: عمل پہلی قرأت پر ہے۔ جوہری نے کہا: و شعفه الحب احرق قلبه۔ ابو زید نے کہا: اس نے اس کو بیمار کر دیا، یعنی شغف کا معنی أمرض ہے جیسے کہا جاتا ہے: قد شغف بکذا فھو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 236 ۔۔۔ 2۔ ایضاً

مشغوف۔ حسن بصری نے قد شعفها پڑھا اور کہا: اس کا باطن محبت سے بھرپور تھا۔ نحاس نے کہا: اکثر اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر مذہب چلا گیا، کیونکہ شتان الجبال سے مراد ان کا بلند ترین حصہ ہے قد شغف بن الك شغفا غین کے سکون کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ جب اس کا شوق دلایا جائے۔ مگر ابو عبیدہ نے امری القیس کا شعر پڑھا:

ایقتلنی وقد شَعَفْتُ فؤادَها کَما شَعَفَ المَهْنُوَّةَ الرَّجلُ والطَّالِی(1)

اس نے کہا: محبت کی سختی اور اس کے جوش کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

شعبی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: الشغف غین کے ساتھ کا معنی ہے محبت اور الشعف عین کے ساتھ کا معنی جنون ہے نحاس نے کہا: قَدْ شَغَفَهَا غین کے کسرہ کے ساتھ بھی اس کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ کلام عرب میں شغفها غین کے فتحہ کے بغیر معروف ہی نہیں۔ اسی طرح شَغَفَهَا، یعنی اس نے اس کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ جنون میں مبتلا ہو چکا تھا۔ سعید بن ابی عروبہ نے حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: الشغاف، سے مراد دل کا حجاب ہے(2)۔ اور الشعاف سے مراد دل کا سیاہ نشان ہے۔ پس اگر محبت شغاف تک پہنچ جاتی تو وہ مر جاتی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الشعاف، دل کے ساتھ ملی ہوئی اس جلد کو کہتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتی اور وہ سفید جلد ہوتی ہے۔ اس (یوسف) کی محبت زلیخاء کی جلد کے ساتھ یوں چمٹ گئی جس طرح جلد دل کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یعنی اس کام میں۔ قتادہ نے کہا: فَتٰىهَا سے مراد فتی زوجها ہے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک تو حضرت یوسف علیہ السلام غلاموں کے حکم میں تھے۔ اور ان کے بارے میں زلیخا کا حکم نافذ تھا۔ مقاتل نے عن ابی عثمان نہدی عن سلمان فارسی کہا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر کو ہبہ کیا تو اس نے پھر ان کو زلیخا، کو ہبہ کر دیا اور کہا: تو اس کو کیا کرے گی؟ تو اس نے کہا: میں اس کو بیٹا بناؤں گی۔ اس نے کہا: یہ تیرا ہے۔ اس نے اس کی پرورش کی حتیٰ کہ وہ جوان ہو گئے اور اس کے (زلیخاء) دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں (کوئی خاص بات نہ تھی) تو وہ بے پردہ ان کے سامنے آتی، بناؤ سنگھار کرتی اور بڑی نرمی سے انہیں بلاتی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ یعنی ان عورتوں کی زلیخا، کی غیبت کو اور اس کے حوالے سے ان کے مکر و فریب کو سنا۔ ایک قول یہ ہے: زلیخا نے ان عورتوں کو اس محبت پر مطلع کیا اور اس راز پر امین بنایا تو انہوں نے اس کے راز کو ظاہر کر دیا تو اس کو ''مکر'' کہا گیا ہے۔ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ کلام میں حذف ہے یعنی ارسلت الیهن تدعوهن الی ولیمة لتوقعهن فیما وقعت فیه مجاہد نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: عزیز مصر کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ میں کھانا تیار کروں اور ان عورتوں کو دعوت دوں تو عزیز مصر نے اسے کہا: اس طرح کر لو، تو اس نے کھانا بنایا پھر ان کے لیے گھر کو مزین کیا اور ان کی طرف دعوت بھیجی کہ ان کے لیے کھانا تیار ہے اور تم میں سے جس جس عورت کو دعوت دی گئی ہے وہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 238 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 237

غیر حاضر نہ ہو۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ چالیس عورتیں تھیں اور ناپسندیدگی کے باوجود وہ آئیں ان کے بارے میں امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

حتی إذا جئنها قسرا ومهدت لهن أنضادا وكبابا

وہب بن منبہ نے کہا: وہ آئیں اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً یعنی اس نے ان کی جگہیں تیار کیں جن کے ساتھ وہ ٹیک لگاتیں گئیں۔ ابن جبیر نے کہا: ہر مجلس میں ایک جام تھا جس میں شہد، مالٹا، اور تیز چھری تھی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے مُتْكًا پڑھا ہے یعنی مخفف غیر مہموز اور قبطیوں کی لغت میں ''المتك'' مالٹے کو کہتے ہیں۔ اور مجاہد نے بھی اسی طرح اس کی تفسیر کی ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: المتكاء، متقل ہونے کی صورت میں اس کا معنی کھانا ہوگا جبکہ ''المتك'' مخفف ہونے کی صورت میں اس سے مراد مالٹا ہے (1)۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الْاِثْمَ بِالصُّوَاعِ جِهَارًا وَتَرَى الْمُتْكَ بَيْنَنَا مُسْتَعَارًا

از دشنوہ کہتے ہیں: اس سے مراد لیموں کا کٹا ہوا درخت ہے۔ جوہری نے کہا: المتك سے مراد وہ ہے جس کو ختنہ کرنے والی باقی چھوڑتی ہے۔ اور المتك کی اصل گوشت کے ساتھ لپٹی ہوئی جھلی ہے۔ اور عورتوں میں سے المتكاء وہ ہے جس کا ختنہ نہ ہوا ہو فراء نے کہا: اہل بصرہ کے ثقہ لوگوں میں سے ایک شیخ نے مجھے بیان کیا ہے کہ ''المتك'' مخفف ہونے کی صورت میں گوشت میں لپٹی ہوئی جھلی ہے اور ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ یہ لیموں کا درخت ہے۔ اس کو اخفش نے بیان کیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد لیموں کا درخت اور شہد ہے جس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فَظِلْنَا بنعمةٍ واتَّكَأْنَا وشَرِبْنَا الحلالَ من قُلِله

اس میں اتکانا سے مراد أكلنا ہے یعنی ہم نے کھایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَعْتَدَتْ العتاد سے مشتق ہے۔

اور مُتَّكَاً کے بارے میں سب سے عمدہ بات وہ ہے جو علی بن ابی طلحہ (2) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد مجلس ہے۔ اور جہاں تک مفسرین کی ایک جماعت کا تعلق ہے جنہوں نے اس سے مراد کھانا لیا ہے تو یہ اس تقدیر پر درست ہوگا۔ طعام متكاء'' جیسے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور اس حذف پر یہ آیت وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دلالت کرتی ہے کیونکہ عورتوں کا چھریوں سمیت آنا وہ کسی ایسے کھانے کے لیے ہی ہے جو چھریوں کے ساتھ کاٹا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اعراب القران'' میں یوں ہی کہا ہے جبکہ اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں انہوں نے کہا: معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے (3): المتكاء سے مراد کھانا ہے اور ایک قول یہ ہے ''المتكاء'' سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ کھاتے، پیتے یا گفتگو کرتے ہوئے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جائے، یہ اہل لغت کے یہاں معروف بات ہے اور اس کے حوالے سے صحیح روایات بھی ہیں۔ قتبی نے کہا کہ کہا جاتا ہے: أتكانا عند فلان یعنی أكلنا، متكاء کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 242 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 238 3۔ ایضاً

اصل موتکأ ہے اسی کی طرح ہیں مُتَّزن اور مُتَّعِد، کیونکہ یہ وزنت، وعدت اور وکأت سے مشتق ہیں۔ اس کا باب اتکأ، یتکئ اتکاء آتا ہے۔ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دونوں مفعول ہیں۔ کسائی اور فراء نے حکایت کیا ہے کہ سکین مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ فراء نے شعر پڑھا ہے:

فَعَيَّثَ فِي السَّنَامِ غَدَاةَ قُرٍّ	بِسِكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَاب

محل استشہاد بِسِكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَاب ہے یہاں سکین مؤنث استعمال ہوتی ہے۔

جوہری نے کہا: اس میں غالب تذکیر ہے، اس نے کہا:

يرى ناصحا فيما بَدَا فإذا خَلَا	فذالك سِكِّيْنٌ على الحَلْقِ حَاذِقُ

جبکہ اس شعر میں سکین کی صفت حاذق استعمال ہوئی جس سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ مذکر ہے۔

اصمعی نے کہا: سکین میں صرف تذکیر ہی معروف ہے۔

وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا مضموم ہوگا، کیونکہ جب بعد میں ضمہ ہو تو کسرہ ثقیل ہوتا ہے اور اصل میں تو تا مکسور ہوگا۔ ایک قول یہ ہے زلیخاء نے ان عورتوں کو کہا: تم نے پھلوں کو کاٹنا اور کھانا نہیں یہاں تک کہ میں تمہیں بتاؤں۔ پھر اس نے اپنے خادم کو کہا: جب میں تجھے کہوں کہ میرے لیے ایلاء کو بلاؤ تو یوسف کو بلانا۔ ایل بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام مٹی میں کام کرتے تھے اس لیے آپ نے اپنی کمر کسی ہوئی تھی اور کلائیوں سے کپڑا لپٹا ہوا تھا تو اس نے اپنے خادم کو کہا: میرے لیے اُیل کو بلاؤ یعنی میرے لیے رب کو بلاؤ۔ عبرانی زبان میں ایل رب کو کہتے ہیں۔ عورتیں حیران ہوئیں اور انہوں نے کہا: وہ کیسے آئے گا؟ خادم اوپر چڑھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا۔ پس جب آپ نیچے اترے تو زلیخاء نے عورتوں کو کہا: جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے کاٹو۔ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ یہاں تک کہ چھریاں ہڈیوں تک پہنچ گئیں۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ ان کے سامنے تب گئے جب زلیخاء نے ان کا بناؤ سنگھار کیا، تو اچانک آپ ان کے سامنے گئے تو وہ مدہوش ہوگئیں اور آپ کے چہرے کے حسن اور اس کی زیب و زینت کے سبب حیران ہوگئیں تو انہوں نے ہاتھوں کو کاٹنا شروع کر دیا اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ مالٹے کاٹ رہی ہیں۔ اَكْبَرْنَهٗ کے معنی میں اختلاف ہے۔ جویبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہوں نے آپ کو عظیم خیال کیا۔ انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ وحشت کی وجہ سے ان کی منی اور مذی خارج ہوگئی۔ شاعر نے کہا:

إذا ما رأين الفحلَ من فوق قَارَةٍ	صَهَلْنَ وأَكْبَرْنَ المَنِيَّ المدفقا

شعر میں أكبرن سے مراد وحشت وخوف کی وجہ سے منی کا خارج ہونا ہے۔

ابن سمعان نے اپنے اصحاب سے روایت کرتے ہوئے کہا: انہوں نے کہا کہ عشق کی وجہ سے ان کی مذی نکل گئی۔ وہب نے کہا: وہ آپ کے عشق میں یوں مبتلا ہوئیں کہ ان میں سے دس عورتیں دہشت، حیرت اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سبب

وجد کی وجہ سے مرگئیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ دہشت کے سبب ان کو حیض آ گیا(1)۔ یہ قتادہ، مقاتل اور سدی کا قول ہے۔ شاعر نے کہا(2):

نأتي النساءَ على أطهارهنّ　　ولا نأتي النّساءَ إذا أكبرنَ إكبارا

ہم عورتوں کے پاس ان کے طہر میں آتے ہیں اور جب انہیں حیض آ جائے تو ہم ان کے پاس نہیں آتے۔ اکبرن سے مراد حیض کا آنا لیا گیا ہے۔

ابوعبیدہ اور دیگر نے اس کا انکار کیا ہے انہوں نے کہا: کلام عرب میں یہ معنی نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ کو بہت بڑا خیال کرنے کی شدت کے سبب ان کو حیض آ گیا ہو، کیونکہ بعض اوقات عورت پر فزع وخوف کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ حمل کو گرا دیتی ہے یا اسے حیض آ جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: أَكْبَرْنَهُ کہا گیا ہے حضنہ نہیں کہا گیا پس پتا چلا اکبار بمعنی حیض نہیں ہے۔ زہری نے جواب دیا اور کہا: ''اکبرت'' کا بمعنی حاضت ہونا ممکن ہے کیونکہ جب ابتدا میں عورت کو حیض آتا ہے تو وہ صغر سنی سے نکل کر کبر میں پہنچ جاتی ہے۔ انہوں نے کہا: اکبرنہ کی ھا، ھا وقف بھی ہوسکتی ہے اس صورت میں یہ کنایہ نہ ہوگی۔ اور یہ ناکارہ بات ہے، کیونکہ ھا وقف وصل کی صورت میں گر جاتی ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ھا فعل کے مصدر سے کنایہ ہے یعنی اکبرن اکبارا بمعنی حضن حیضا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پہلے قول کے مطابق تو ھا ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہوگی یعنی أعظمن یوسف وأجللنه۔

وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ مجاہد نے کہا: قطعنها سے مراد القینها ہے(3)۔ ایک قول یہ ہے: خدشنها یعنی زخمی کر دیا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: چھری کے ساتھ زخمی کر دیا۔ نحاس نے کہا: مجاہد کی مراد یہ ہے کہ ایسا کاٹنا نہیں تھا کہ جس میں ہاتھ علیحدہ ہو گئے ہوں بلکہ یہ صرف زخم اور خراشیں تھیں اور یہ بات تو لغت میں معروف ہے کہ جب کوئی انسان اپنے دوسرے دوست کے ہاتھ کو زخمی کر دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ عکرمہ نے کہا: اَیْدِیَهُنَّ سے مراد اکمامهن ہے(4) مگر اس معنی میں بعد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اَیْدِیَهُنَّ سے مراد ان کی انگلیوں کے پورے ہیں، یعنی انہوں نے کٹنے اور زخم لگنے کی وجہ سے کوئی درد محسوس نہ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل حضرت یوسف علیہ السلام میں مشغول تھے اس لیے انہوں نے کوئی درد محسوس نہ کیا۔ تقطیع کثرت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہاتھ کئی جگہوں سے کٹ گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کٹنے والے ہاتھوں کی تعداد ہی زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی معاذ اللہ۔ اصمعی نے نافع سے روایت کیا ہے کہ اس نے اسے اسی طرح پڑھا ہے جس طرح ابو عمرو بن العلاء نے پڑھا وَقُلْنَ حَاشَا لِلّٰهِ یعنی الف کو ثابت رکھ کے اور یہی اصل ہے۔ اور جس نے الف کو حذف کیا ہے اس نے للہ کے لام کو اس کے عوض بنا دیا ہے۔ اس میں چار لغتیں ہیں حَاشَاكَ، حَاشَالَكَ، حَاشَ لَكَ اور حَشَالَكَ۔ اور اسی طرح حَاشَا زَيدٍ اور حاشا زیدًا کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن زید سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 245　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　4۔ ایضاً

سنا: نصب اولی ہے(1) کیونکہ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ فعل ہے جیسے ان کا قول: حاش لزید اور اس میں سے کسی حرف کو حذف بھی نہیں کیا جاتا۔ نابغہ نے کہا ہے:

وَلَا أُحَاشِي من الأقوامِ من أحَدِ

احاشی واحد متکلم کا صیغہ ہے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حاش حرف ہے اور احاشی فعل ہے اور حاش کے بعد جر کا واقع ہونا اس کے فعل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ابوزید نے ایک اعرابی سے حکایت کی ہے: اللھم اغفرلی ولمن یسمع، حاشا الشیطان وابا الأصبغ، تو اس نے بھی نصب ہی دی ہے۔ حسن بصری نے وقلن حاش للہ سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے حاش الالہ بھی مروی ہے، جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے "حاشَ اللہ" بغیر لام کے پڑھا ہے۔ اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

حاشا أبي ثَوبانَ إنَّ بِهِ ضَنًّا عنِ المَلْحَاةِ والشَّتْمِ(2)

یعنی حاشا لابی ثوبان نہیں بلکہ حاشا ابی ثوبان ہے۔

زجاج نے کہا: کلمہ کی اصل حاشیہ سے ہے اور الحَشا معنی الناحیۃ ہے۔ آپ کہتے ہیں: كنتُ في حَشَا فلانٍ یعنی میں فلاں کے کونے میں تھا، اور آپ کا قول حاشا لزید یعنی زید اس سے جدا ہوا اور اس سے دور رہا۔ اس صورت میں تمام مذکورین میں سے باہر نکلنے اور جدا ہونے کی استثنا ہوگی۔

ابوعلی نے کہا: یہ المحاشاۃ سے فاعل ہے یعنی حاشا یوسف وصار فی حاشیۃ وناحیۃ مما قُرِف بہ، یا اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف بشر ہونے سے دور ہے، پس حاشا اور حاش سیبویہ کے نزدیک استثنا کی صورت میں حرف جر ہیں اور مبرد اور ابوعلی کے قول کے مطابق فعل ہیں۔

مَا هٰذَا بَشَرًا خلیل اور سیبویہ نے کہا کہ ما، لیس کی طرح ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لیس زید قائماً، اور مَا هٰذَا بَشَرًا اور مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ کوفیوں نے کہا: جب با کو حذف کیا جائے تو پھر نصب دی جاتی ہے۔ اس کی تشریح احمد بن یحییٰ نے کی کہ جب آپ ما زید بمنطلق کہتے ہیں تو با کا محل نصب ہوتا ہے، اسی طرح تمام حروف جر کی صورتحال ہے اور جب با کو حذف کیا جائے تو نصب دی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے محل پر دلالت کرے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یہ فراء کا قول ہے۔ اس نے کہا مَا کوئی عمل نہیں کرتا۔ بصریوں نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ انہیں یوں کہنا چاہیے: زید القمر کیونکہ اس کا معنی ہے زیدٌ کالقمر۔ احمد بن یحییٰ نے یہ کہتے ہوئے اس کی تردید کی ہے کہ با کو حروف جر میں کاف سے زیادہ داخل کیا گیا ہے، کیونکہ کاف اسم ہے۔ نحاس نے کہا: بصریوں کی بات ہی درست ہے اور اس بات میں تناقض ہے کیونکہ فراء نے ما بمنطلقٍ زیدٌ کو جائز قرار دیا ہے اور شعر بھی پڑھا ہے۔

أَمَا واللهِ أَنْ لو كنتَ حُرًّا وما بالحُرِّ أنتَ ولا العَتِيقِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 248

شعر میں ما بالحر محل استشہاد ہے۔

اور اس نے نصب سے منع کیا ہے، اور ہم نحویوں کے درمیان اس قول کے جواز پر کسی اختلاف کو نہیں جانتے: مافیكَ براغبٍ زیدٌ اور ما الیك بقاصدٍ عمروٌ پھر وہ با کو حذف کر دیتے ہیں اور انہیں رفع دے دیتے ہیں۔ بصریوں اور کوفیوں نے ما زیدٌ منطلقٌ رفع کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے کہ یہ لغت تمیم ہے اس پر انہوں نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

أتیما تجعلون إلیَّ ندًا وما تیمٌ لِذِی حَسَبٍ نَدِیدٌ

ماتیمٌ محل استشہاد ہے۔

النِّد والندِیدُ والنَّدِیدۃُ کا معنی ہے مثل اور نظیر۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ یہ تہامہ اور نجد کی لغت ہے۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ رفع دونوں صورتوں میں سے زیادہ قوی صورت ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ غلط ہے، کتاب اللہ اور لغت رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ قوی اور اولیٰ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصحف حفصہ رضی اللہ عنہا میں مَا ھٰذَا بِبَشَرٍ ہے۔ اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: عورتوں نے یہ بات ذکر کی کہ صورت یوسف، صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے بلکہ یہ تو ملکی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین) دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہوگی ان کا قول: حَاشَ لِلّٰهِ یہ فی الحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے بہلانے کے الزام سے برأت کا اظہار ہے یعنی یوسف تو اس سے دور ہے۔ اور ان کا قول لِلّٰهِ سے مراد لخوفہ یعنی براۃ للہ من ھذا یعنی یوسف اس سے نجات پا گیا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ یہ گناہوں سے بری ہونے میں فرشتوں کی طرح ہے۔ اس صورت میں کوئی تناقض اور تضاد باقی نہیں رہتا۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بہت زیادہ جمال اور خوبصورتی کی وجہ سے صورت میں بشر کے ساتھ مشابہت سے پاکی کو بیان کرنا ہے۔ اور لِلّٰهِ کا قول اسی معنی کی تاکید ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے عورتوں نے یہ بات اس گمان پر کہی کہ ان کے نزدیک فرشتے کی صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے اور ان تک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین) نہیں پہنچا کیونکہ یہ تو ہماری کتاب میں ہے۔ بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں کا یہ گمان ہے کہ اگر ان عورتوں کی یہ بات گمان باطل ہوتا تو اللہ تعالیٰ پر ان کی اس بات کی تردید اور ان کے جھوٹ کو واضح کرنا واجب تھا۔ اور یہ باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی واجب اور لازم نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ پر یہ لازم ہے کہ جہاں بھی وہ کافروں کے کفر اور جھوٹوں کے جھوٹ کے متعلق خبر دے تو اس کے ساتھ ہی ان کا رد بھی کرے۔ اور اسی طرح اہل عرف قبیح چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ شیطان ہے اور عمدہ چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کی مثل نہیں دیکھی کیونکہ انسان فرشتوں کو نہیں دیکھتے اس کی بنیاد بھی اسی گمان پر ہے کہ فرشتوں کی صورت زیادہ خوبصورت ہے۔ یا پھر اس کی بنیاد فرشتے کے اخلاق کی طہارت اور تہمت سے اس کے دور ہونے پر ہے۔ اِنْ ھٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ یعنی یہ نہیں مگر فرشتہ۔ شاعر نے کہا:

فلست لانسی ولكن لملاك تنزل من جو السماء يصوب

تو انسان نہیں بلکہ ایسا فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترا ہے۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے: مَا هٰذَا بِشِرًى با اور شین کے کسرہ کے ساتھ، یعنی یہ خریدا ہوا غلام نہیں اس جیسے آدمی کو بکنا نہیں چاہیے پس مصدر کو اسم مفعول کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ جس طرح فرمایا گیا اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) یعنی مصیدہ۔ اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ماهذا بثمن یعنی اس جیسے آدمی کے ثمن اور قیمت نہیں لگائی جا سکتی ہے۔ اور اس صورت میں شراء سے مراد وہ ثمن ہونگے جن کے ذریعے خریدا جاتا ہے، جس طرح کہ جب کوئی آدمی کہے هذا بألف تو اس کی بات کو رد کرنا مقصود ہو تو اس کو کہا جائے ماهذا بألِف اس اعتبار سے با اس محذوف کے متعلق ہوگی جو کہ خبر ہے گویا کلام یوں ہے: ماهذا مقدراً بشراءٍ اور عام قُراء کی قراءت اس کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ اس کے بعد اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ آپ کی فضیلت میں مبالغہ ہے ملائکہ کی جنس میں آپ کی شان کی تعظیم کے طور پر۔ اور بِشِرٰی جیسے الفاظ قرآن کریم میں یا کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ جب عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو زلیخا نے اپنے عذر (محبت) کو الفاظ میں ظاہر کیا لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ، فیہ کی ہ ضمیر سے مراد ہے فی حبہ اور ذالک معنی هذا ہے یہ طبری کا مختار موقف ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ''ہ'' ضمیر محبت کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا۔ ذالکن الحب الذی لمتننی فیہ یعنی حُبُّ هٰذَا هُوَ ذَالِكَ الْحُبُّ اور ''اللوم'' سے مراد قباحت و برائی کے ساتھ کسی کی صفت بیان کرنا ہے۔ پھر زلیخا نے اقرار کرتے ہوئے کہا: وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ، فَاسْتَعْصَمَ کا معنی ہے وہ رک گیا اور عصمت کو اسی لیے عصمت کہا جاتا ہے کہ یہ معصیت اور نافرمانی کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''اِسْتَعْصَمَ'' کا معنی اِسْتَعْصٰی ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ وَ لَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ زلیخا نے دوبارہ ان عورتوں کی موجودگی میں آپ کو گناہ کی ترغیب دلائی اور حیاء کی چادر اتار پھینکی اور گناہ نہ کرنے کی صورت میں آپ کو قید کی دھمکی دی اور اس نے یہ کاروائی اس وقت کی جب اسے نہ ملامت کا ڈر تھا اور نہ ہی گفتگو کا خوف بخلاف پہلی دفعہ کے۔ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ یعنی ذلیل و رسوا۔ مصحف میں وَ لَيَكُوْنًا کو الف کے ساتھ لکھا گیا اور تاکید کے لیے نون مخففہ کے ساتھ پڑھا گیا اور نون تاکید ثقیلہ بھی ہوتا ہے اور خفیفہ بھی اور لَيُسْجَنَنَّ پر نون کے ساتھ وقف کیا گیا کیونکہ یہ مثقلہ ہے اور لَيَكُوْنًا پر الف کے ساتھ وقف کیا گیا اس کے مخففہ ہونے کی وجہ سے اور یہ رایت رجلاً و زیداً و عمراً کی طرح نون اعراب کے مشابہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ (العلق) اس کے مشابہ ہے۔ جس طرح کہ اعشیٰ کا قول ہے:

ولا تعبدِ الشيطانَ واللهَ فاعبدا

یعنی تو شیطان کی عبادت نہ کر اور اللہ کی عبادت کر۔ اس کی مراد یہاں ''فاعبدا'' ہے تو جب اس نے اس پر وقف کیا تو الف کے ساتھ کیا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

''یوسف نے عرض کی: اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں) مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے مکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے۔ پس قبول فرمالی اس کی دعا اس کے رب نے اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر و فریب کو، بے شک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور (ان کے حالات) خوب جاننے والا ہے''۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ، السِّجْنُ اصل میں دخول السجن ہے مضاف کو حذف کر دیا گیا یہ قول زجاج اور نحاس کا ہے۔ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی یہ میرے لیے معصیت و نافرمانی میں مبتلا ہونے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جیل میں داخل ہونا کوئی پسندیدہ اور محبوب بات ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ تو الله تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے یوسف! السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ کہہ کے تو نے اپنے آپ کو قید کر لیا، اگر آپ ۔ ۔ کہ عافیت میرے نزدیک پسندیدہ ہے تو میں آپ کو عافیت دے دیتا۔ ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے السَّجْنُ کو سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ ابن ابی اسحاق، عبدالرحمن، اعرج اور یعقوب کی قرآت ہے اور، سجنہ سجنا کا مصدر ہے۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ، كَیْدَهُنَّ سے مراد عورتوں کا مکر ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان عورتوں کا مکر ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا، کیونکہ انہوں نے آپ کو عزیز مصر کی بیوی کی بات مان لینے کو کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ مظلوم ہے اور آپ نے اس پر ظلم کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے عزیز کی بیوی کے بارے میں نصیحت کرنے کے لیے خلوت کا مطالبہ کیا اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ زلیخا کے حق میں وہ آپ کو علیحدہ کریں اور اس کی مدد و تعاون کرنے کی بات کریں کہ شاید آپ مان جائیں، تو ہر ایک نے خلوت حاصل کر لی اور ہر ایک نے آپ کو کہا: اے یوسف! میری ضرورت کو پورا کرو میں تمہارے لیے تمہاری مالکہ کی نسبت بہتر ہوں تو ہر ایک نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی اور آپ کو بہلایا پھسلایا، تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! وہ ایک تھی اب پوری جماعت ہو گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عزیز کی بیوی کا مکر ہے جو اس نے آپ کو گناہ کی دعوت دی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے کیدھا کہنے کے بجائے جمع کی ضمیر یا تو اس کے بڑے پن کی وجہ سے استعمال کی یا پھر تصریح سے تعریض کی طرف خروج کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا، اور کید سے مراد دھوکے بازی کی کوشش ہے، اسی وجہ سے عرب جنگ کو کید کہتے ہیں کیونکہ اس میں لوگوں کا مکر و فریب اور دھوکہ بازی کا عمل ہوتا ہے۔ عمرو بن لجار نے کہا:

تراث کی تکیدک أم بشر وکید بالتبرج ما تکید

اَصْبُ اِلَیْهِنَّ جواب شرط ہے یعنی میں ان کی طرف مائل ہو گیا ہوتا۔ یہ صَبَا یَصْبُو، صُبُوًّا و صَبوۃً سے ہے یہ اس وقت

بولا جاتا ہے جب کوئی مائل ہو جائے اور اس میں اشتیاق پیدا ہو جائے۔

شاعر نے کہا:

إِلَى هِنْدٍ صَبَا قَلْبِي وَهِنْدٌ مِثْلُهَا يُصْبِي(1)

ہند کی طرف میرا دل مائل ہوا اور ھند جیسی عورت کی طرف مائل ہوا جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو گناہ سے بچنے کے سلسلہ میں مجھ پر مہربانی نہ فرماتا تو میں اس میں واقع ہو جاتا۔ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان جاہلین میں سے ہو جاتا جو گناہ کا ارتکاب کر کے مذمت کے مستحق بن جاتے ہیں یا اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو جاہلوں جیسے کام کرتے ہیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر اس کی نافرمانی سے نہیں بچ سکتا اور یہ جہالت کی قباحت اور جاہل کی مذمت پر بھی دلیل ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! مجھ سے ان کے مکر کو دور کر، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور آپ پر مہربانی فرماتے ہوئے آپ کو زنا میں واقع ہونے سے بچالیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو دور فرمادیا۔ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ، كَيْدَهُنَّ کو جمع ذکر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے مل کر آپ کو بہلایا تھا یا اس سے مراد عورتوں کا مکر ہے یا پھر عزیز مصر کی بیوی کا مکر ہے جس طرح کہ سابق آیت میں گزر چکا ہے۔ اس کو عموم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

"پھر مناسب معلوم ہوا انہیں اس کے باوجود کہ وہ (یوسف کی پاکبازی کی) نشانیاں دیکھ چکے تھے کہ وہ اسے قید کر دیں کچھ عرصہ تک"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ یعنی عزیز اور اس کے مشیروں کے لیے ظاہر ہوا مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کی علامات اور نشانیاں ہیں، جس طرح کہ قمیص کا پیچھے سے پھٹنا، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا، حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات سے ان عورتوں کا قلت صبر وغیرہ۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ آپ کو قید کر دیں تاکہ وہ اس قصہ کو عام لوگوں میں مشہور ہونے سے چھپا سکیں اور قید کو حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے درمیان حائل کر سکیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آیات سے مراد وہ برکات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ان میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے ان پر ظاہر ہوئیں لیکن پہلی توجیہ زیادہ صحیح ہے۔

مقاتل نے مجاہد عن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 252

کہا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمیص، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا اور ان عورتوں کا آپ کو بہت بڑا سمجھنا یہ سب نشانیوں میں سے ہے۔ آپ کو قید کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔ ایک قول کے مطابق لوگوں میں رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا اور زلیخا کو شرمندگی اور مایوسی کے خوف نے اسے پردے میں رکھنے پر راضی ہونے پر مجبور کر دیا یہ حیلہ اس نے اس لیے کیا تھا تا کہ جب اسے اس کے دیدار سے روک دیا جائے تو (اس کی خبروں سے اپنے بے تاب دل کو) تسلی و تشفی دے گی۔ شاعر نے کہا:

وما صَبابةُ مشتاقٍ على أملٍ   من اللِقاء كمشتاقٍ بلا أَمَلِ

ملاقات کی امید پر مشتاق کی سوزش عشق اس طرح نہیں جس طرح بغیر امید کے مشتاق کی محبت ہوتی ہے۔

یا پھر اس کو یہ توقع تھی کہ قید ان کو میری اطاعت پر مجبور کر دے گی اور یہ اس بات پر راضی ہو جائیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ لَيَسْجُنُنَّهٗ ارشادگرامی میں يَسْجُنُنَّهٗ فاعل کی جگہ میں ہے، ای ظهرلهم ان يسجنوه یعنی ان کے سامنے یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ آپ کو قید میں ڈال دیں، یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مبرد نے کہا: یہ غلط ہے۔ فاعل پورا جملہ نہیں ہوتا البتہ فاعل وہ ہے جس پر بَدَا دلالت کر رہا ہے اور وہ ہے مصدر؛ یعنی بَدَا لَهُمْ بَدَاءٌ تو فاعل کو اس وجہ سے حذف کر دیا گیا کہ فعل اس پر دلالت کر رہا ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

وحقَّ لمن أبوموسىٰ أبوهٗ   يُوَفِّقه الذي نصب جبالٗ

یہاں وحقَّ الحقُّ تھا تو الحقُّ فاعل کو حذف کر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: ثم بَدَا لَهُمْ رَأْيٌ لَمْ يَكُونُوا يَعْرِفُونَهٗ اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام میں اس پر دلالت موجود ہے اسی طرح قول کو بھی حذف کر دیا گیا یعنی اصل میں تھا قالوا لَيَسْجُنُنَّهٗ لام مفتوح یمین مضمر کے جواب میں ہے یہ فراء کا قول ہے۔ اور یہ فعل مذکر ہے مونث نہیں کیونکہ اگر مونث ہوتا تو يَسْجُنَّانِهٖ ہوتا۔ اس پر لَهُمْ کا قول دلیل ہے لَهُنَّ ارشاد نہیں ہوا، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور ان کے معاونین کی طرف سے خبر دی اور مذکر کو غلبہ دے دیا یہ ابوعلی کا قول ہے۔ سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا سبب یہ تھا کہ عزیز کی بیوی کو یہ شک ہوا کہ آپ نے اس کی تشہیر کی اور اس کی اس خبر کو پھیلا دیا ہے اس صورت میں لَهُمْ کی ضمیر بادشاہ کے لیے ہوگی۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰى حِيْنٍ یعنی نامعلوم مدت تک۔ یہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شہر میں پھیلی ہوئی خبر کے ختم ہونے تک، سعید بن جبیر نے کہا: چھ ماہ تک۔ الکیا نے بیان کیا کہ اس نے تیرہ ماہ مراد لیے ہیں۔ عکرمہ نے 9 سال کی مدت بیان کی ہے۔ کلبی نے پانچ سال اور مقاتل نے سات سال بیان کی ہے۔ البقرہ میں حین اور اس پر مرتب ہونے والے احکام گزر چکے ہیں۔ وہب نے کہا: آپ بارہ سال قید میں رہے۔ اور حَتّٰى بمعنی اِلٰى ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (القدر) اللہ تعالیٰ نے قید کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اس عورت کا ارادہ کرنے کی خطا سے طہارت کا سبب بنا دیا اور عزیز مصر اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جرات کو

جان چکا تھا اس کے باوجود آپ کو قید کرنے میں گویا اپنی بیوی کی اطاعت کر رہا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام سے تین مرتبہ فروگزاشت ہوئی ہے: جب آپ نے زلیخا کا ارادہ کیا تو قید میں ڈالے گئے، جب آپ نے نوجوانوں کو اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ کہا تو کئی سال جیل میں ٹھہرے رہے اور جب بھائیوں کو اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ (یوسف) کہا تھا تو انہوں نے کہا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (یوسف: 77) (تم چور ہو تو انہوں نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے اس سے قبل چوری کی تھی)

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر قید کے ذریعے مجبور کیا گیا اور پانچ سال تک آپ قید خانہ میں رہے اور اپنے مقام و مرتبہ کی عظمت کی وجہ سے اس کو ترجیح دی، اور اگر کسی آدمی کو قید کے ذریعے زنا پر مجبور کیا جائے تو بالاجماع اس کے لیے جائز نہیں۔ اور اگر مارنے کے ذریعے مجبور کیا جائے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ مشکل ہو تو اس سے زنا کا گناہ اور حد ساقط ہو جائے گی۔ ہمارے (مالکیہ) بعض علماء نے کہا: یہ بات اس سے حد کو ساقط نہ کرے گی لیکن یہ ضعیف قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر دو عذاب جمع نہیں کرتا اور نہ ہی دو مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ یہ تو دین میں بہت بڑا حرج ہے جبکہ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور اس نے دین میں تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں بنائی۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۃ ''النحل'' میں آئے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا اور مکر و فریب سے اس کی پناہ مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٨﴾

''اور داخل ہوئے آپ کے ساتھ ہی قید خانہ میں دو نوجوان ان میں سے ایک نے (آکر) کہا کہ میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اٹھائے ہوئے ہوں اپنے سر پر کچھ روٹیاں، پرندے کھا رہے ہیں اس سے، آپ بتایئے ہمیں اس کی تعبیر، بے شک ہم دیکھ رہے ہیں آپ کو نیکو کاروں سے۔ آپ نے فرمایا: نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں کھلایا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتا دوں گا اس کی تعبیر اس سے پیشتر کہ کھانا تمہارے پاس آئے، یہ ان

علموں میں سے ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رب نے، میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، اور میں تو پیرو بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لیے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو، یہ (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ اس احسان پر شکر ہی بجا نہیں لاتے''۔

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ۔ فَتَيٰنِ، فتی کا تثنیہ ہے؛ اور یہ یائی ہے اور عربوں کا قول: الفُتُوُّ شاذ ہے۔ وہب اور دیگر لوگوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کر کے قید خانے کی طرف گدھے پر سوار کر کے لایا گیا اور کہا گیا: هٰذَا جَزَاءُ مَنْ يَّعْصِ سَيِّدَتَهٗ یہ سزا ہے اس کی جس نے اپنی مالکن کی نافرمانی کی، جبکہ آپ فرما رہے تھے: یہ آگ کے لباس، تارکول کی قمیص، پیپ کے پینے اور زقوم کھانے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ پہنچے تو آپ نے اس میں کچھ ایسے لوگ پائے جن کی امیدیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی آزمائش و ابتلا انتہائی سخت ہو چکی تھی تو آپ نے ان سے فرمایا: صبر کرو اور خوش رہو تمہیں اس پر اجر ملے گا تو انہوں نے آپ کو کہا: اے نوجوان: تیری گفتگو کتنی خوبصورت ہے، ہمیں تیرے پڑوس کی وجہ سے برکتیں نصیب ہوں اے نوجوان! تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحٰق بن خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب عورت نے اپنے شوہر کو کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے رسوا کیا، میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے قید کر دیں تو اس نے آپ کو قید خانے میں قید کر دیا تو آپ اس میں پریشان حال کو دلاسہ دیتے، بیمار کی عیادت کرتے، زخمی کا علاج کرتے، ساری رات عبادت کرتے اور روتے یہاں تک کہ آپ کے ساتھ گھروں کی دیواریں، ان کی چھتیں اور دروازے بھی روتے، آپ کے سبب قید خانے کو پاکیزگی حاصل ہوئی اور قیدی آپ سے مانوس ہوئے؛ یہ صورتحال ہوگئی کہ جب کوئی آدمی قید خانے سے نکلتا تو وہ واپس لوٹ آتا اور قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بیٹھتا، قید خانے کے انچارج نے آپ کے ساتھ محبت کرتے ہوئے اسے آپ کے لیے وسیع کر دیا، پھر آپ کو کہا: اے یوسف! میں آپ کے ساتھ اتنی محبت کرتا ہوں جتنی کسی اور چیز کے ساتھ نہیں کرتا، تو آپ نے فرمایا: میں تیری محبت سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس نے کہا: ایسا کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرے باپ نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے بھائیوں نے میرے ساتھ کیا جو کچھ کیا، میری مالکن نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے اوپر وہ مصیبت نازل ہوئی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔

آپ قید میں تھے کہ بادشاہ اپنے نانبائی اور اپنے ساقی پر ناراض ہو گیا، سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے لوگوں کے درمیان لمبا عرصہ گزارا تو وہ اس سے تنگ ہو گئے تو انہوں نے خباز اور ساقی کے ذریعے سازش کی وہ دونوں کھانے اور شراب میں زہر ملا دیں، خباز نے ان کی بات مان لی اور ساقی نے انکار کر دیا، ساقی بادشاہ کے پاس گیا اور اسے اس بات کی خبر دی تو بادشاہ نے ان دونوں کو قید کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ تو یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام سے مانوس ہو گئے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ایک قول یہ ہے کہ خباز نے کھانے میں زہر ملا دی، جب کھانا پیش کیا گیا تو ساقی نے

کہا: اے بادشاہ! نہ کھایئے کھانا زہر آلود ہے۔ خباز نے کہا: اے بادشاہ نہ پیجئے! شراب زہر آلود ہے۔ تو بادشاہ نے ساقی کو کہا: پیو! تو اس نے شراب پی لی اور شراب نے اسے کوئی نقصان نہ دیا، بادشاہ نے خباز کو کہا: تم کھاؤ؛ تو اس نے انکار کر دیا، کھانا ایک جانور کو کھلایا گیا تو وہ اسی جگہ مر گیا، تو بادشاہ نے ان دونوں کو ایک سال کے لیے قید کر دیا، اور وہ دونوں اس مدت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں رہے ساقی کا نام منجا اور دوسرے کا مجلث ہے، یہ ثعلبی نے کعب سے بیان کیا ہے۔ نقاش نے کہا: ایک کا نام شرہم تھا اور دوسرے کا سرہم؛ طبری نے کہا: جس نے (خواب میں) دیکھا تھا کہ وہ شراب نچوڑتا ہے وہ نبو تھا، سہیل نے کہا: دوسرے کا نام بھی ذکر کیا گیا ہے اور میں نے اس کو محفوظ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فَتَیٰنِ فرمایا، کیونکہ وہ دونوں غلام تھے اور غلام کو فتی کہتے ہیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا؛ اس بات کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: شاید ان کے عرف میں غلام کا نام فتی تھا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتی خادم کا نام ہو اگرچہ وہ مملوک نہ ہو۔

ممکن ہے کہ بادشاہ نے ان دونوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید کیا ہو ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کے بعد ان کو قید کیا ہو یا آپ سے پہلے ان کو قید کیا گیا ہو البتہ جس کمرے میں آپ تھے اس میں وہ آپ کے ساتھ داخل ہوئے۔ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا اس سے مراد انگور کو نچوڑنا ہے حضرت یوسف علیہ السلام قیدیوں کو فرماتے تھے کہ میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ دونو جوانوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: آؤ ہم اس عبرانی غلام کا تجربہ کریں؛ تو انہوں نے کسی چیز کو دیکھے بغیر آپ سے سوال کیا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں نے آپ سے آپ کے علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ تو انہوں نے اپنے خوابوں کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: ان کے سچے خواب تھے جو انہوں نے دیکھے اور ان کے متعلق آپ سے پوچھا؛ اسی وجہ سے ان کی تعبیر بھی صحیح اور سچی تھی۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: ''تم میں سے جو از روئے خواب کے جتنا سچا ہوگا اتنا ہی وہ از روئے کلام کے سچا ہوگا۔'' ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے خواب جھوٹے تھے اور انہوں نے صرف تجربہ کرنے کے لیے آپ سے ان کے متعلق پوچھا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: ان دونوں میں سے جس کو پھانسی دی گئی وہ جھوٹا تھا اور دوسرا سچا، یہ ابومجلز کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کی: ''جس نے جھوٹا خواب بیان کیا قیامت کے دن اس کو دو جو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا اور وہ ان دونوں کو نہیں باندھ سکے گا'' (2)۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی آپ نے فرمایا: ''جس نے اپنے خواب کے بارے میں جھوٹ بولا اسے قیامت کے دن جو کو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا'' (3)۔ (ابو عیسیٰ نے) کہا: حدیث حسن۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب ان دونوں نے اپنے خواب دیکھے تو وہ پریشان ہو گئے؛ حضرت یوسف علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الوصایا، جلد 2، صفحہ 241

2۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، ما جاء فی الذی یکذب حلمہ، جلد 2، صفحہ 52، ایضاً، حدیث نمبر 2208، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

السلام نے انہیں فرمایا: میں تمہیں پریشان کیوں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ہمارے سردار! ہم نے خواب میں ناپسندیدہ بات دیکھی ہے؛ آپ نے فرمایا: مجھے بتاؤ، تو انہوں نے آپ کو وہ بات بتائی اور کہا: ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتایئے؛ یہ بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان کے خواب تھے۔ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ آپ کا احسان یہ تھا کہ آپ مریض کی عیادت کرتے اور اسے دوا دیتے تھے، پریشان و غمزدہ کو دلاسہ دیتے، جب اس کو ضرورت ہوتی تو اس کی خدمت کرتے اور اس کے لیے (لوگوں کو) کہتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ سے مراد العالمین الذین أحسنوا العلم یہ فراء کا قول ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ لَنَا اِنْ فَسَّرْتَهٗ کہ اگر آپ اس کی وضاحت کردیں تو آپ ہمارے محسنین میں سے ہوں گے۔ جس طرح کوئی آدمی کہتا ہے: ایسا کرو تو تم احسان کرنے والے ہو گے۔ آپ نے فرمایا: تم نے کیا دیکھا ہے؟ خباز نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے تین تنوروں میں روٹیاں پکائیں انہیں تین ڈبوں میں رکھ دیا، اوران کو اپنے سر پر رکھ لیا تو ایک پرندہ آیا اور اس میں سے کھا گیا۔ دوسرے نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے سفید انگور کے تین گچھے لیے انہیں تین برتنوں میں نچوڑا، پھر اپنی پہلی عادت کے مطابق وہ میں نے بادشاہ کو پلا دیا، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا یعنی انگور لغت عمان کے مطابق (انگور کو خمر کہتے ہیں)(1)۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اسے اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا پڑھا ہے۔ اصمعی نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے بتایا ہے کہ وہ ایک اعرابی کو ملے اس کے پاس انگور تھے تو انہوں نے اسے کہا: تیرے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا: ''خمر'' ایک قول یہ ہے: اَعْصِرُ خَمْرًا کا معنی ہے ''عنب خمر'' تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ اور خَمْرَةٌ، خمر اور خُمُوْرٌ کہا جاتا ہے جس طرح کھجور کے بارے میں تمرةٌ، تمرٌ اور تُمُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ قَالَ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو فرمایا: لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یعنی کل تمہارے گھر سے تمہارے لیے کھانا نہیں لایا جائے گا۔ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ مگر میں تمہیں اس کی تاویل بتا دوں گا تا کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میں تمہارے خوابوں کی تعبیر جانتا ہوں، تو انہوں نے کہا: بیان کرو! آپ نے انہیں فرمایا: تمہارے پاس ایسا ایسا کھانا لایا جائے گا۔ تو کھانا اسی طرح کا تھا جس طرح آپ نے فرمایا؛ یہ علم غیب تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ اور آپ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس علم کے ساتھ اس لیے خاص فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی قوم کی ملت کو چھوڑا تھا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی تھی یعنی بادشاہ کے دین کو۔ میرے (قرطبی) کے نزدیک اس کلام کا معنی ہے: تمہارے خوابوں کی تعبیر کا علم، تمہارے پاس لائے جانے والے کھانے کا علم اور اللہ کے دین کا علم، پس سب سے پہلے وہ سنو جو دین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ اسی وجہ سے آپ نے ان کو تعبیر نہ بتائی بلکہ پہلے اسلام کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ ایک قول یہ ہے: آپ کو علم تھا کہ ان میں سے ایک کو قتل کر دیا جائے گا تو آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی، تا کہ وہ یہ سعادت حاصل کرلیں۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں تعبیر بتانے کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ ایک کے لیے یہ تعبیر ناپسندیدہ ہے لہٰذا آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 257

نے ان کے سوال سے اعراض برتا اور دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کردی اور فرمایا: لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ یعنی نیند کی حالت میں اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا مگر میں تمہیں اس کی تفسیر بیداری کی حالت میں بتادوں گا، یہ سدی کا قول ہے۔ انہوں نے آپ کو کہا: یہ تو کاہنوں اور قیافہ شناسوں کا عمل ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: میں کاہن نہیں ہوں، یہ تو ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے میں تمہیں کہانت اور ستاروں کے ذریعے ان کی خبر نہیں دوں گا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے ہوگا۔ ابن جریج نے کہا: بادشاہ جب کسی آدمی کو قتل کرنا چاہتا تو اس کے لیے کھانا تیار کراتا اور اس کی طرف بھیجتا تھا(1)۔ تو معنی یہ ہوگا: تمہارے پاس حالت بیداری میں کھانا نہیں لایا جائے گا تو اس اعتبار سے تُرْزَقَانِهِ کا معنی ہوگا بادشاہ یا اس کے علاوہ کسی اور کی طرف سے تمہارے پاس آئے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جو تمہیں اللہ تعالیٰ رزق دے گا۔ حضرت حسن نے کہا: آپ انہیں غیب چیز کی خبر دے رہے تھے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے ان دونوں کو اس طریقے سے اسلام کی دعوت دی اور آپ نے اس کو ایسا معجزہ بنادیا جس کے ذریعے انہوں نے غیب کے ذریعے خبر کی طرف راہنمائی حاصل کی۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ کیونکہ یہ انبیاء برحق تھے مَا كَانَ یعنی نہیں چاہیے کہ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ "من" تاکید کے لیے ہے۔ جس طرح تیرا قول: مَا جَاءَنِي مِنْ أَحَدٍ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا یہ آپ کے زنا سے بچنے کی طرف اشارہ ہے وَعَلَی النَّاسِ یعنی ان مومنین پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرک سے بچایا ہے۔ ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا کہ اس نے ہمیں انبیاء بنایا، وَعَلَی النَّاسِ کہ ہم کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور ایمان پر (اکثر لوگ شکر نہیں کرتے)۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

"اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو! (یہ بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ تم نہیں پوجتے اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی دلیل، نہیں ہے حکم (کا اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو بجز اس کے یہی دین قیم ہے لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ یعنی اے قید خانے کے دو باسیو۔ آپ نے صحبت کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ اس میں لمبی دیر مقیم رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 259

جس طرح کہ اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کہا جاتا ہے۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ یعنی بچپن، بڑھاپے اور جوانی میں، یا اس سے مراد تعداد میں متفرق ہونا ہوگا۔ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ایک قول کے مطابق خطاب ان دونوں جوانوں اور دیگر قیدیوں کے لیے ہے اور ان کے سامنے ایسے بت تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے تو آپ نے حجت کو لازم کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا یعنی کئی معبود کوئی نفع ونقصان نہیں دے سکتے خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ جس نے ہر چیز پر غلبہ پایا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ (النمل) ایک قول یہ ہے: تفرق کے ذریعے آپ نے اس جانب اشارہ فرمایا کہ اگر معبود متعدد ہو جائیں تو وہ ارادہ میں مختلف ہو جائیں گے اور بعض بعض سے بلند ہو جائیں گے اور آپ نے واضح کر دیا کہ جب ان میں تفرق ہوگا تو وہ معبود نہیں ہوں گے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً آپ نے بتوں کے عجز اور کمزوری کو بیان کیا ارشاد فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی تم عبادت نہیں کرتے مگر ایسے اسماء والوں کی عبادت کرتے ہو جن کا کوئی معنی نہیں۔ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ یعنی جو نام تم نے اپنی طرف سے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اسماء سے مراد مسمیات ہیں یعنی تم ایسے بتوں کی عبادت کرتے ہو جن کے لیے سوائے معبودیت کے نام کے اور کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ وہ جمادات ہیں۔ فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا حالانکہ آغاز میں خطاب صرف دو کو تھا کیونکہ آپ نے ان تمام لوگوں (کو سمجھانے کا) قصد کیا جو شرک کے حوالے ان دونوں جیسے تھے۔

اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مفعول ثانی کو دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا ہے معنی ہوگا: سَمَّیْتُمُوْهَا اٰلِهَةً مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ، مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ، اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل نہیں فرمایا۔ سعید بن جبیر نے کہا: مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی حجت میں سے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ جو سب کا خالق ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ قیم بمعنی القویم ہے وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ﴿۴۱﴾

"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! (اب خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک (یعنی پہلا) تو پلایا کرے گا اپنے مالک کو شراب لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور (نوچ) کھائیں گے پرندے اس کے سر سے، (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کو کہا: تو تین دن کے بعد بادشاہ کو شراب پلانے والی سابقہ ڈیوٹی پر واپس چلا جائے گا اور دوسرے سے کہا: تجھے تین دن تک بلایا جائے گا اور سولی چڑھا دیا جائے گا پرندے تیرے سر سے (نوچ) کھائیں گے، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے کوئی

(خواب) نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: تو نے دیکھا ہے یا نہیں قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ (اٹل) فیصلہ ہو چکا ہے اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ سقی اور اسقی دونوں لغتیں ہیں معنی دونوں کا ایک ہے، جس طرح کہ شاعر نے کہا:

سَقَى قومِي بَنِي مَجْدٍ وأَسْقَى نُمَيْرًا والقبائلَ من هِلال

اس شعر میں سقی اور أسقی ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی میری قوم نے بنی مجد، نمیر اور ہلال کے قبائل کو پلایا۔

نحاس نے کہا: جس بات پر اکثر اہل زبان کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ سقا کا معنی یہ ہے کہ اس نے اس کو پکڑا اور پی لیا یا اس نے اپنے حلق میں پانی انڈیلا اور أسقا کا معنی ہے اس نے اسے پلایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا (المرسلات: 27) یعنی ہم نے تمہیں پلایا ماء فرات۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے (مالکی) علماء نے کہا: اگر یہ کہا جائے کہ جس نے اپنے خواب میں جھوٹ بولا اور تعبیر کرنے والے نے اس کی تفسیر بیان کر دی تو آیا اس کا حکم اسے لازم ہو جائے گا؟ ہم نے کہا: اسے یہ لازم نہ ہوگا۔ البتہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی کی تعبیر فیصلہ ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمادیا کہ یہ معاملہ یوں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے معاملہ اسی طرح کر دیا جس طرح آپ نے خبر دی اور یہ آپ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے: عبدالرزاق عن معمر عن قتادہ روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس نے کہا: میں نے دیکھا کہ گویا میں ہرے بھرے مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک جگہ پر پہنچا ہوں پھر شاداب مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک مقام پر پہنچا ہوں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو ایک ایسا آدمی ہے کہ تو ایمان لائے گا پھر کفر اختیار کرے گا پھر ایمان لائے گا اور پھر کفر اختیار کرے گا، پھر تو کفر کی حالت میں مرے گا، تو آدمی نے کہا: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تیرے لیے فیصلہ ہو چکا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے (قیدی) ساتھی کے لیے ہو گیا تھا، تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ معاملہ کسی اور کے لیے نہیں کیونکہ آپ کی زبان پر حق جاری تھا اور آپ کی کیفیت یہ تھی کہ جب آپ گمان کرتے وہ گمان ہوتا تھا اور جب آپ کلام فرمادیتے تو واقع ہو جاتا تھا جس طرح کہ روایات میں ہے اور ایسی روایات کثیر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا تو آپ نے اسے فرمایا: میں آپ کو کاہن گمان کرتا ہوں تو وہ ویسا ہی تھا جیسا آپ نے گمان کیا؛ اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ آپ نے ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا تو اس نے آپ کو کہا کہ اس کے دوزخ کے سارے نام ہیں، تو آپ نے اسے فرمایا: تو نے اپنے اہل کو پالیا اور وہ سارے جل چکے ہیں تو وہ اسی طرح تھا جس طرح آپ نے ارشاد فرمایا، یہ روایت صاحب مؤطا نے بیان کی ہے اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ ''الحجر'' میں آئے گی۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اور کہا (یوسف علیہ السلام) نے اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے آقا کے پاس لیکن فراموش کرا دیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے بادشاہ کے پاس، پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں ظَنَّ بمعنی أیقن ہے اور قتادہ نے ظَنَّ کی تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے جو یقین کے برعکس ہوتی ہے، انہوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی نجات کا گمان کیا کیونکہ تعبیر کرنے والا گمان ہی کرتا ہے اور تیرا رب جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے؛ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح اور انبیاء کے حال کے زیادہ مشابہ ہے اور (اس وجہ سے بھی کہ) آپ نے جو دو جوانوں کو خواب کی تعبیر بتائی وہ وحی تھی اور لوگوں کے حق میں یہ گمان ہوتا ہے جہاں تک انبیاء کی بات کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس کا حکم حق اور سچ ہے خواہ وہ جس طرح بھی ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اپنے آقا کے پاس اور لغت میں آقا کو رب کہنا معروف ہے اعشیٰ نے کہا:

رَبِّی کَرِیْمٌ لا یُکَدِّرُ نِعْمَةً وإذا تُنُوشِدَ فی المَهَارِقِ أَنْشَدَا

ربی کریم سے مراد ہے کہ میرا آقا کریم ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ تو نے دیکھا اور خواب کی تعبیر کے حوالے سے میری جو صورتحال ہے بادشاہ کے سامنے اس کا ذکر کرنا اور اس کو یہ کہنا کہ میں مظلوم ہوں اور بغیر جرم کے قید ہوں۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو پلا (1)، اپنے رب کو کھلا، اپنے رب کو وضو کروا بلکہ اسے ربی کے بجائے سیدی، مولای کہنا چاہیے''۔ اور قرآن کریم میں اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ، الی ربك اور اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ سے مراد ''صاحبی'' میرا صاحب یعنی عزیز مصر ہے۔ اور ہر وہ آدمی جو کسی چیز کی اصلاح و اتمام کرتا ہے اسے رَبَّهٗ یَرُبُّهٗ، فهو رَبٌّ له کہا جاتا ہے۔ علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی (جس میں رب کہنے کے بجائے سیدی، مولای کہنے کی ترغیب ہے) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ فقط نصیحت کے طور پر ہے نہ کہ اس وجہ سے ہے کہ اس نام کا اطلاق حرام ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: أَن تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّهَا یعنی لونڈی اپنے مالک اور آقا کو جنے گی۔ آپ کا ارشاد آدمی پر ''رب'' کے لفظ کے اطلاق کے حوالے سے قرآن کے مطابق ہے تو اس سلسلہ میں نہی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان اسماء کے اطلاق کو اپنی عادت نہ بنالیں بلکہ ان کو ترک کرنا زیادہ عمدہ اور اولیٰ ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ آدمی کا عبدی اور أمتی کہنا دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ایک معنی یہ ہے کہ عبودیت فی الحقیقت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے؛ تو کسی کا لوگوں میں سے اپنے مملوک کو عبدی اور أمتی کہنا اور اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف ان الفاظ کے ساتھ کرنا جن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نام کی وجہ سے مملوک کے دل میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا خیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز اسے نافرمانی پر ابھارے گی۔ ابن شعبان نے الزاھی کے بارے میں کہا: لا یقل السید عبدی وأمتی ولا یقل المملوك رَبِّي ولا رَبّتِي کہ آقا عبدی اور امتی نہ کہے اور غلام ربی اور ربتی نہ کہے" تو یہ اسی معنی پر محمول ہوگا جس کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یقل العبد ربی ولیقل سیدی (1) کہ غلام ربی نہ کہے بلکہ سیدی کہے، کیونکہ رب اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور بالاتفاق اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ جبکہ "سید" میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں نہیں تو فرق واضح ہو گیا کیونکہ اس صورت میں کوئی التباس اور اشکال نہیں رہتا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس صورت میں بھی یہ فرق ہوگا کہ اس کا استعمال اور شہرت اس طرح نہیں جس طرح رب کا استعمال اور شہرت ہے اور ابن عربی نے کہا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں جائز ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَأَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ۔ فَأَنْسٰهُ میں ہ ضمیر کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی شیطان نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا یہ اس طرح کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی کو کہا: اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو گویا آپ نے اس لیے کہا کہ وہ آپ کو نجات دلائے گا اور پہلی حالت میں واپس لوٹا دے گا تو اس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا بھول گئے اور مخلوق سے استغاثہ کی طرف مائل ہوئے تو آپ کو قید میں ٹھہرا کر اس پر عتاب کیا گیا۔ عبدالعزیز بن عمیر کندی نے کہا: جبرئیل امین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانہ میں آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اسے پہچان گئے تو کہا: اے ڈرانے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیسے دیکھ رہا ہوں؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے طاہر بن طاہرین! اے پاکبازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: کیا تمہیں بندوں سے مدد طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا؛ تو آپ نے کہا: اے جبریل! کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ جبریل نے کہا: ہاں، تو آپ نے کہا: مجھے (اس مشقت کی) کوئی پرواہ نہیں۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب کیا اور آپ کی قید کو لمبا کر دیا۔ جبریل نے آپ سے کہا: اے یوسف! آپ کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل سے کس نے نجات دلائی؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: کنوئیں سے آپ کو کس نے نکالا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: فاحشہ عورت سے آپ کو کس نے بچایا؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: عورتوں کے مکر کو آپ سے کس نے دور کیا؟ آپ نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: پھر تو نے کیسے مخلوق پہ اعتماد کر لیا اور اپنے رب کو چھوڑ دیا کہ تو نے اس سے سوال نہیں کیا؟ آپ نے کہا: اے پروردگار! مجھ سے یہ کلمہ لغزش میں سرزد ہو گیا۔ اے ابراہیم، اسحاق اور شیخ یعقوب علیہم السلام کے معبود! میں تجھ سے رحم کا سوال کرتا ہوں، جبریل نے آپ سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو کئی سال قید میں رہے گا۔ ابوسلمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحم اللہ یوسف لولا الکلمۃ التی قال (1): اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ۔ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ اللہ تعالیٰ یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ کا کلمہ نہ کہتے تو کئی سال قید خانہ میں نہ رہتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے نجات پانے والے جوان سے کہا: اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ تو کئی سال تک قید کو لمبا کر کے آپ کو سزا دی گئی۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کو یاد کیا ہوتا تو وہ آپ کو چھٹکارا نصیب فرماتا۔ اسماعیل بن ابراہیم عن یونس عن الحسن روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یوسف کا کلمہ یعنی اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ نہ ہوتا آپ قید میں اتنا عرصہ نہ رہتے جتنا رہے''۔ راوی نے کہا: پھر حسن روتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں بھی کوئی مسئلہ بنتا ہے تو ہم لوگوں کے سامنے اس کی شکایت کرتے ہیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ فَاَنْسٰىهُ کی ''ہ'' ضمیر نجات پانے والے جوان کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ بھولنے والا ہے؛ یعنی ساقی کو شیطان نے اس بات سے بھلا دیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرے۔ اس آیت میں حذف ہے اصل میں ہے أنساہ الشیطان ذکرہ لربہ بعض علماء نے اس قول کو ترجیح دی ہے انہوں نے کہا: اگر شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلایا ہوتا تو آپ کو قید میں ٹھہرانے کی سزا کا مستحق قرار نہ دیا جاتا کیونکہ بھولنے والا مؤاخذہ کا مستحق نہیں ہوتا۔ پہلے قول والوں نے یہ جواب دیا ہے کہ نسیان بعض اوقات ترک کے معنی میں ہوتا ہے تو جب آپ نے اللہ کا ذکر ترک کیا اور شیطان نے آپ کو اس طرف بلایا تو آپ کو سزا دی گئی؛ دوسرے قول والوں نے ان کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ذریعے کی: وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ (یوسف: 45) اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد۔ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بھولنے والا وہ ساقی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: 42) بے شک میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ شیطان کو انبیاء پر غلبہ حاصل ہی نہیں؟ ایک قول یہ ہے: نسیان سے سوائے ایک صورت کے انبیاء بھی معصوم نہیں اور وہ ایک صورت یہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگوں تک پیغام پہنچاتے ہیں یعنی وحی الٰہی کی تبلیغ میں اس میں وہ معصوم ہیں۔ اور اگر ان سے ایسے معاملات میں نسیان سرزد ہو جائے جن میں سرزد ہو سکتا ہے تو اسے مطلق شیطان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور یہ نسبت نہیں کی جا سکتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نسیان کی خبر دی ہو اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان کی طرف نسیان کی نسبت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نسی آدم

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 265

فنسیت ذریتہ (1) حضرت آدم علیہ السلام کو نسیان ہوا تو ان کی اولاد کو بھی نسیان ہوا، آپ نے فرمایا: إنما أنا بشر أنسی کما تنسون (2) میں بشر ہوں میں بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ اس پر بحث گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ، بِضْعَ زمانے کا ایک حصہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ یعقوب نے عن ابی زید کہا: بَضع اور بِضع کہا جاتا ہے یعنی با کے فتح اور کسرہ کے ساتھ۔ اکثر علماء نے کہا: بضع و مائۃ نہیں کہا جاتا، اس کا اطلاق نوے تک ہوتا ہے، ہروی نے کہا: عرب بِضْعَ کو تین سے لیکر نو کے درمیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بِضْع اور بضعۃ ایک ہی ہے ان دونوں کا معنی عدد کا ایک حصہ ہے۔ ابوعبیدہ نے بیان کیا کہ بِضْعَ چار کے نصف سے کم حصے کو کہتے ہیں ان کی مراد ایک سے لے کر چار کے درمیان کے اعداد ہیں۔ مگر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا: وکم البضع، بِضْعَ کیا ہے (3)؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تین سے نو تک کے درمیان۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذھب فزاید فی الخطر۔

اکثر مفسرین کے نزدیک بِضْعَ سے مراد سات ہے یہ ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ ماوردی نے کہا: یہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور قطرب کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تین سے نو تک (4)، یہ اصمعی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تین سے دس تک۔ زجاج نے کہا: یہ تین سے پانچ کے درمیان ہے۔ فراء نے کہا: بِضْعَ کو دس اور بیس سے لے کر نوے تک کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور سو کے بعد اس کو ذکر نہیں کیا جاتا۔

وہ مدت جس میں حضرت یوسف علیہ السلام قید رہے اس کے بارے میں تین قول ہیں۔ ایک: سات سال (5)، یہ ابن جریج قتادہ اور وہب بن منبہ کا قول ہے، وہب نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں مبتلا رہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں رہے۔

دوسرا: بارہ سال، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

تیسرا: چودہ سال، یہ ضحاک کا قول ہے۔ مقاتل نے مجاہد عن ابن عباس کہا: حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پانچ اور کچھ سال رہے۔ اس کا اشتقاق بضعت الشیء سے ہے یعنی قطعتہ۔ پس یہ عدد کا ایک قطعہ ہے پس اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گزشتہ پانچ سال کی قید کے بعد سات یا نو سال قید کی سزا دی پس بِضْعَ عقوبت کی مدت ہے نہ کہ کل قید کی مدت۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں قید رہے اور حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں رہے اور بخت نصر کو سات سال مسخ کا عذاب دیا گیا۔ عبداللہ بن راشد بصری نے عن سعید بن ابی عروبہ کہا کہ بِضْعَ کا اطلاق پانچ سے لے کر بارہ سال کے عرصے کے درمیان پر ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں یقین کے حصول کے باوجود اسباب کو پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے۔ بے شک تمام

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اعراف، جلد 2، صفحہ 132 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، سورۂ روم، جلد 2، صفحہ 151

4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 267 5۔ ایضاً

امور مسبب کے قبضہ میں ہیں لیکن اس نے ایک سلسلہ بنایا ہے اور بعض معاملات کو بعض کے ساتھ ملا دیا ہے پس ان اسباب کو اختیار کرنا سنت ہے اور ان کو انتہا تک پہنچا دینا یقین ہے اور جو چیز اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے وہ نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے وقت پیش آیا۔ یہ واضح ہے پس اس میں غور کرو۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

"اور (کچھ عرصہ بعد ایک روز) بادشاہ نے کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی کھا رہی ہیں انہیں سات دبلی گائیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات خشک سوکھے ہوئے، آؤ درباریو بتاؤ مجھے میرے خواب کی تعبیر اگر تم خوابوں کی تعبیر بتایا کرتے ہو"۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی آزادی قریب آئی تو بادشاہ نے خواب دیکھا۔ جبریل امین نازل ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو سلام کیا اور آزادی کی خوشخبری سنائی اور کہا: اللہ تعالیٰ تجھے قید سے نکالنے والا ہے اور زمین میں تجھے اقتدار دینے والا ہے، بادشاہ کو اور جابر لوگوں کو تیرا مطیع و فرمانبردار بنائے گا اور تجھے تیرے بھائیوں پر کلمہ علیا عطا فرمائے گا اور یہ اس خواب کی وجہ سے ہے جو بادشاہ نے دیکھا اور وہ یہ ہے اور اس کی تاویل ایسی، ایسی ہے پس آپ قید میں اس سے زیادہ نہیں رہے جتنا کہ بادشاہ نے خواب دیکھا تھا حتیٰ کہ باہر آگئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلے خواب کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے آزمائش اور سختی بنایا اور دوسری مرتبہ اسی کو خوشخبری اور رحمت بنایا۔ اور وہ یوں کہ بڑے بادشاہ ریان بن ولید نے خواب میں دیکھا کہ گویا خشک نہر سے سات موٹی گائیں نکلیں اور ان کے پیچھے سات دبلی پتلی، عجاف سے مراد کمزور گائیں ہیں۔ تو دبلی گائیں موٹی پر حملہ آور ہوئیں انہیں کانوں سے پکڑا اور سوائے سینگوں کے انہیں کھا گئیں، اور سات سرسبز خوشے دیکھے ان پر سات خشک خوشے حملہ آور ہوئے اور انہیں کھا گئے اور اب ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ بچی اور وہ خشک خوشے سرسبز و شاداب خوشوں کو کھانے کے باوجود خشک ہی رہے اسی طرح دبلی پتلی گاؤں میں بھی موٹی گاؤں کو کھانے کے باوجود کوئی اضافہ نہ ہوا۔ خواب نے بادشاہ کو پریشان کیا تو اس نے لوگوں کو اہل علم کو، جادو، علم نجوم اور کہانت کو جاننے والوں اور معززین قوم کی طرف پیغام بھیجا، اس نے انہیں کہا: یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اس نے اپنا خواب ان کے سامنے بیان کیا، لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ابن جریج نے کہا کہ مجھے عطا نے کہا ہے: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد جھوٹے اور غلط خواب ہیں۔ جویبر نے عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا: کچھ خواب سچے ہوتے ہیں اور کچھ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ یعنی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ہروی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد اخلاط احلام ہے۔ لغت میں الضغث سے مراد کسی چیز کا گٹھہ ہوتا ہے جس طرح کہ سبزی، گھاس اور ان کے مشابہ دیگر اشیاء یعنی انہوں نے کہا: آپ کا خواب واضح نہیں ہے۔ احلام سے مراد غلط ملط خواب ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا:

اَضْغَاثُ سے مراد وہ خواب ہے جس کی کوئی تاویل نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ، سَبْعَ کے آخر سے ھا کو حذف کر دیا گیا تا کہ مذکر اور مونث میں فرق رہے۔ سِمَانٍ بقرات کی صفت ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ سَبْعَ بَقَرٰتٍ سمانا بھی جائز ہے اس صورت میں سمانا سبع کی صفت ہوگا اسی طرح خضرا بھی جائز ہے۔ فرآء نے کہا: سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (الملک: 3) اسی کی طرح ہے، جبکہ ''بقرۃ'' کا مادہ اشتقاق اور معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: بکری اور گائے جب شہر میں داخل ہوں تو اگر وہ موٹی ہوں تو یہ خوشحالی کا سال ہوتا ہے اور اگر وہ دبلی ہوں تو وہ سال سخت ہوتا ہے اور اگر وہ شہر سمندری شہر ہو تو اس میں ان کی تعداد اور حالت کے مطابق کشتیاں آتی ہیں ورنہ وہ پے در پے آزمائشیں ہیں، گویا کہ وہ آزمائشیں گائیں کا منہ ہیں، جس طرح کہ حدیث میں یشبہ بعضها بعضا کے الفاظ ہیں اور متن کے حوالے سے ایک اور حدیث میں ہے کانها صیاصی البقر یعنی گویا وہ گائیوں کے سینگ ہیں۔ اس میں مراد ان فتنوں کو گاؤں کے سینگوں کے ساتھ مشابہت دینا ہے اور اگر وہ مکمل طور پر زرد ہوں تو پھر وہ بیماریاں ہیں جو لوگوں پر حملہ آور ہیں اور اگر ان کے رنگ مختلف ہوں، بڑے سینگوں والی ہوں اور لوگ ان سے بھاگ رہے ہوں یا ان کے منہ سے آگ اور دھواں نکل رہا ہو تو وہ لشکر ہے یا غارت گری یا وہ ایسا دشمن ہے جو ان پر حملہ آور ہے اور ان کے گھروں میں اترا ہوا ہے۔ اور بعض اوقات ''بقرۃ'' بیوی، خادم، غلہ اور سال پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں بچہ، غلہ اور بنات ہوتا ہے۔ ''يَاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ'' ''عَجُفَ يَعْجُفُ'' بروزن عَظُمَ يَعْظُمُ ہے جبکہ عَجِفَ يَعْجَفُ بروزن حَمِدَ يَحْمَدُ بھی آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ، رؤیا کی جمع رؤی ہے یعنی مجھے اس خواب کے انجام کے متعلق خبر دو اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ یہ عبور النہر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عبرت النهر یعنی میں نہر کے کنارے پر پہنچا، خواب کی تعبیر سے مراد اس کا انجام ہوتا ہے۔ للرؤیا میں لام تبیین کے لیے ہے یعنی اگر تم تعبیر کر سکتے ہو تو بیان کرو۔ زجاج نے کہا: رؤیا کے لیے ہے۔

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''درباریوں نے کہا: (اے بادشاہ) یہ خواب پریشان ہیں، ہم پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ فراء نے کہا: أَضغاثَ أحلامِ بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: نصب بہت دور کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تو نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کی تعبیر ہو، یہ تو صرف اضغاث احلام یعنی غلط ملط خواب ہیں۔ أضغاث کا واحد ضغث ہے۔ سبزی اور گھاس وغیرہ کے گٹھے کو ضغث کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

كضغث حلم غرّ منه حالمه

وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ زجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم غلط ملط خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

انہوں نے اپنے آپ سے اپنے علم کی نفی کی جس کی تعبیر نہ ہو نہ کہ انہوں نے اپنے آپ سے علم التاویل کی نفی کی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سے تعبیر کے علم کی ہی نفی کر دی۔ اس بنیاد پر اضغاث سے مراد خوابوں کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں سے کچھ صحیح اور کچھ باطل ہوں اسی وجہ سے ساقی نے کہا: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ اس کو پتہ چل گیا کہ لوگ تعبیر کرنے سے عاجز آ گئے ہیں یہ نہیں کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تعبیر ہے ہی نہیں۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے تفسیر و تعبیر کا قصد و ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے بادشاہ کے سینے سے ان کو مٹانا چاہا تا کہ اس کا دل ان میں مشغول نہ ہو۔ اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس کا علم تھا۔ الْاَحْلَامِ ''حلم'' کی جمع ہے اور حلم اسے کہتے ہیں جس کو سونے والا دیکھتا ہے اسی سے حلم اور احتلم ہے اسی طرح حَلَمْتُ بکذا وحلمته بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَحَلَمْتُها وبَنُو رُفَيْدَةَ دُونَها لايَبْعَدَنَّ خَيالُها المَحْلُومُ

اس کی اصل اناۃ ہے جبکہ اسی سے حلم ہے جو طیش کی ضد ہے نیند کے اندر دکھائی دی جانے والی بات کو حلم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ نیند اطمینان اور سکون کی حالت ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس آدمی کے قول کے بطلان پر دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ خواب اس آدمی پر واقع ہو جاتی ہے جو اس کی تعبیر بتاتا ہے کیونکہ لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ حالانکہ ایسا ہوا نہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر خشک سالی اور خوشحالی کے ساتھ کی اور معاملہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آپ نے اس کی تعبیر کی۔ اس میں اس بات کے فاسد ہونے پر دلیل ہے کہ خواب اڑتے پرندے کی ٹانگ پر ہوتا ہے، جب اس کی تعبیر کی جائے تو واقع ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد میں بتاتا ہوں تمہیں اس خواب کی تعبیر، مجھے (قید خانہ) تک جانے دیجیے۔ اے یوسف! اے صدیق! بتایئے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازہ گائیں ہیں، کھا رہی ہیں انہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سر سبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک تا کہ میں (آپ کا جواب لے کر) واپس جاؤں لوگوں کی طرف شاید وہ (آپ کے علم و فضل کو) جان لیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا یعنی بادشاہ کا ساقی وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ یعنی عرصہ بعد (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سے مروی ہے، اور اسی سے الی أمة معدودة ہے۔ ابن درستویہ نے کہا: أمته سے مراد حین نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ اس میں مضاف کو حذف نہ مانا جائے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام نہ رکھا جائے گویا کہ وادکر بعد حین أمة یا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 270

بعد زمن أمة یا اس جیسے الفاظ کہے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور أمة لوگوں کی بڑی جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ لفظاً واحد ہے جبکہ معنی میں جمع، اور حیوانات کی ہر جنس ایک امت ہے حدیث طیبہ میں ہے: لولا أن الکلاب أمة من الأمم لأمرت بقتلها(1) یعنی اگر کتے ایک امت نہ ہوتے تو میں انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا۔

اللہ کے ارشاد وَادَّكَرَ سے مراد یہ ہے کہ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی ضرورت یاد آئی اور وہ آپ کا قول اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ہے۔ عفان نے ہمام عن قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وادکر بعد أمة پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس، عکرمہ اور ضحاک کی معروف قرأت وادکر بعد أمة ہے ہمزہ کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ معنی ہوگا کہ وہ اس کو یاد آیا بھول جانے کے بعد۔ شاعر نے کہا:

أَمِهْتُ وَكُنْتُ لَا أَنْسَى حَدِيثًا كَذَاكَ الدَّهْرُ يُودِي بِالْعُقُولِ

شُبیل بن عزرۃ الضبعی سے ہے: بعد أمه الف کے فتحہ، میم کے سکون اور ھا کے ساتھ اور یہ الأمه کی مثل ہے یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی نسیان ہے۔ جب کوئی بھول جائے تو کہا جاتا ہے: أَمِهَ يَأْمَهُ أَمْهًا۔ اس بنیاد پر وادکر بعد أمه ہوگا۔ اس کو نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور رجل امه سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل جاتی رہی ہو۔ جوہری نے کہا: جوزہری کی حدیث میں أمه بمعنی اقرار اور اعتراف ہے تو یہ لغت غیر مشہورہ ہے۔ اُشہب عقیلی نے کہا: بعد إمة یعنی بعد نعمة، یعنی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نجات دے کر ایسے انعام فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: وہ نوجوان حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قضا کی وجہ سے بھول گیا تاکہ آپ کچھ مدت قید خانہ میں رہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: وہ بھولا نہیں تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں بادشاہ کو دوبارہ اس کا وہ جرم یاد نہ آجائے جس کی وجہ سے بادشاہ نے اسے اور نانبائی کو قید کیا تھا وَادَّكَرَ یعنی اس نے ذکر کیا اور خبر دی۔ نحاس نے کہا: اذکر کی اصل اذتکر ہے ذال، تا کا قریب المخرج حرف ہے اس کو اس میں ادغام کرنا جائز نہیں کیونکہ ذال مجہورہ ہے اور تا مہموسہ، اگر ادغام کیا جائے تو جہر جاتا رہے گا سو تا کا حرف مجہورہ کے ساتھ ابدال کیا گیا جو کہ دال ہے اور تا کو دال سے بدلنا اس کو طا کے ساتھ بدلنے سے بہتر ہے کیونکہ طا مطبقہ ہے تو اس طرح یہ اذدکر ہو گیا پس ذال کو دال میں ادغام کر دیا گیا دال کی رخاوت اور لین کی وجہ سے۔ پھر ارشاد فرمایا: أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ یعنی میں تمہیں خبر دیتا ہوں۔ حضرت حسن نے أنا أتیکم بتاویله پڑھا ہے۔ بادشاہ نے کہا: ایک عجمی کافر انہیں کیسے بتائے گا؟ نحاس نے کہا: أُنَبِّئُكُمْ کا معنی ہے: میں تمہیں صحیح اور عمدہ خبر دوں گا، یعنی میں پوچھوں گا پھر تمہیں خبر دوں گا۔

فَأَرْسِلُونِ وہ مخاطب تو بادشاہ کو ہوا اگر تعظیماً جمع کا صیغہ استعمال کیا یا پھر وہ بادشاہ اور اہل مجلس کو مخاطب ہوا۔ يُوسُفُ ندا مفرد ہے اسی طرح الصِّدِّيقُ یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ أَفْتِنَا یعنی انہوں نے اسے بھیجا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: اے صدیق! اور آپ سے بادشاہ کے خواب کے متعلق پوچھا۔ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ یعنی بادشاہ اور اس کے اصحاب کی طرف۔ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ اس کا مفعول التعبیر ہے یا پھر اس کا مفعول مکانک من الفضل والعلم ہے یعنی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصید، حدیث 2462۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، باب النہی عن اقتناء الکلب، حدیث 2195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شاید وہ علم و فضل میں آپ کے مقام و مرتبہ کو جان لیں اور آپ کو آزاد کر دیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ الناس سے مراد بادشاہ ہو اور تعظیما اسے ایسا کہا گیا ہو۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۝

''آپ نے فرمایا کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسب دستور تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لیے نکال لو) جسے تم کھالو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ تَزْرَعُوْنَ جب اس نے آپ کو خواب کے بارے میں بتایا تو آپ نے اس کے سامنے اس کی تفسیر کرنا شروع کی، آپ نے فرمایا: سات موٹی تازہ گائیں اور شادات خوشوں سے مراد سات سرسبز و شاداب سال ہیں۔ اور دبلی پتلی اور لاغر گائیں اور خشک خوشے سات قحط والے سال ہیں۔ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا یعنی لگا تار، مسلسل، یہ مصدر علی غیر المصدر ہے کیونکہ تَزْرَعُوْنَ کا معنی تدأبون کعادتکم فی الزراعۃ سبع سنین یعنی تم اپنی عادت کے مطابق سات سال کاشت کرتے رہو گے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حال ہے یعنی دائبین۔ ایک قول یہ ہے: سَبْعَ سِنِیْنَ کی یہ صفت ہے یعنی دائبۃ۔ ابو حاتم نے یعقوب سے دأبا حکایت کیا ہے حمزہ کی حرکت کے ساتھ۔ اسی طرح حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں، ابو حاتم کا قول ہے: یہ دئب سے ہے۔ نحاس نے کہا: اہل لغت صرف دأب کو ہی جانتے ہیں۔ دوسرا قول۔ یہ متحرک ہے کیونکہ اس میں حروف حلق میں سے ایک حرف ہے یہ فراء کا قول ہے فراء نے کہا: اور اسی طرح ہر وہ حرف جس کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہو تو اس کی تثقیل جائز ہے جب اس کا دوسرا حرف ہمزہ، حا، عین، غین، ھا اور خا ہو اور اس کی اصل عادت ہے، شاعر نے کہا:

كَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا (1)

جس طرح حویرث کی ماں سے پہلے تمہاری عادت اور طریقہ ہے۔

اس کے متعلق گفتگو سورۃ ''آل عمران'' میں گزر چکی ہے۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ ایک قول یہ ہے: (آپ نے یہ حکم اس لیے دیا) تاکہ اسے گھن نہ لگ جائے اور وہ زیادہ باقی رہنے والا ہو جائے؛ دیار مصر میں ایسا ہی ہوتا ہے اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ یعنی ضروری مقدار اس میں سے نکال لو، آپ کی طرف سے یہ قول امر ہے جبکہ پہلا خبر یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا بھی امر ہو مگر زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ وہ خبر ہے، تو تَزْرَعُوْنَ کا معنی ''ازرعوا'' ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کریمہ مصالح شرعیہ یعنی حفظ الادیان، حفظ النفوس، حفظ العقول، حفظ الانساب اور حفظ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 274

الاموال کے حوالے سے اصل وضابطہ ہے پس ہر وہ چیز جو ان امور میں سے کسی امر کے حصول کی ضامن ہو تو وہ مصلحت ہے اور جو ان میں سے کسی چیز کو ختم کرنے والی ہو وہ مفسدہ ہے اس کو دور کرنا مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شرائع کا مقصود لوگوں کو ان کے دنیوی مصالح کی طرف رہنمائی کرنا ہے تاکہ ان کے ذریعے ان پر اللہ تعالیٰ کی معرفت وعبادت حاصل ہو جائے جو اخروی سعادت تک پہنچانے والی ہیں۔ اس کی رعایت اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ورحمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر فرمایا جو نہ تو اس پر واجب ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا استحقاق ہے یہ تمام اہل سنت کے جملہ محققین کا مذہب ہے اس کی تفصیلات اصول فقہ میں ہیں۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝۴۸

''پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا ان کے لیے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کرلو گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعٌ شِدَادٌ یعنی قحط والے سال۔ يَّاْكُلْنَ مجاز ہے اور معنی ہوگا یاکلن أھلھن، مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ یعنی جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہوگا۔ جس طرح کہ کہنے والے کا قول:

نهارُكَ يا مغرورُ سهوٌ وغفلةٌ ولَيلُكَ نومٌ والرَّدَى لَكَ لازمُ(1)

اے مغرور! تیرا دن بھول اور غفلت ہے اور تیری رات نیند ہے اور گھٹیا پن تجھے لازم ہے۔ (سہو وغفلت کی نسبت دن کی طرف اور نیند کی نسبت رات کی طرف)

حالانکہ دن نہیں بھولتا اور رات نہیں سوتی بلکہ دن میں بھولا جاتا ہے اور رات میں سویا جاتا ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے بیان کیا: حضرت یوسف علیہ السلام دو آدمیوں کا کھانا رکھتے اور اسے ایک آدمی کے قریب کرتے تو وہ اس کا بعض حصہ کھا لیتا یہاں تک کہ جب وہ دن آیا تو آپ نے وہ اس کے قریب کیا تو وہ سارا کھا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ ان سات سخت سالوں میں سے پہلا دن ہے۔ اِلَّا قَلِيْلًا استثنا کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ یعنی اس میں سے جو تم محفوظ رکھتے ہو تاکہ تم اسے کاشت کرو، کیونکہ بیج کو باقی رکھنے میں خوراک کی حفاظت ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: تم جس کو حرز میں رکھتے ہو۔ قتادہ نے کہا: تُحْصِنُوْنَ کا معنی تدخرون یعنی تم ذخیرہ کرتے ہو۔ معنی ایک ہی ہے، یہ بات ضرورت کے وقت کے لیے کھانے کو ذخیرہ کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کافر کے خواب کے صحیح ہونے میں اصل ہے اور اس کی تعبیر وہی کی جائے گی جو اس نے دیکھا بالخصوص جب اس کا تعلق کسی مومن کے ساتھ ہو۔ (اگر کافر کے خواب کی یہ صورتحال ہے تو) اس خواب کی کیا کیفیت ہوگی جو نبی کے لیے اللہ کی نشانی، رسول کے لیے معجزہ، مصطفیٰ کریم ﷺ کی تبلیغ کے لیے تصدیق اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 275

درمیان واسطہ کے لیے محبت بن رہا ہو۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ۝٤٩

''پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کے لیے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ایسی خبر ہے جو بادشاہ کے خواب میں نہیں تھی بلکہ یہ اس علم غیب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک سال کے علم کا اضافہ فرمادیا جس کے متعلق انہوں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا اس کا سبب آپ کی فضیلت کا اظہار، اور علم و معرفت میں آپ کا مقام و مرتبہ کا اعلان تھا۔ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ یہ الاغاثہ یا الغوث سے مشتق ہے۔ آدمی نے مدد طلب کی، اس نے کہا: واغوثاہ۔ اور اسم الغوث، الغُواث اور الغَواث ہے اور استغاثنی فلان فأغثتہ یعنی فلاں نے مجھ سے مدد طلب کی تو میں نے اس کی مدد کی۔ اور اسم الغیاث ہے، واؤ، ماقبل کے کسرہ کی وجہ سے یا ہوگیا۔ اور الغیث بارش کو کہتے ہیں۔ قد غاث الغیث الارض سے مراد بارش کا زمین کو پہنچنا ہے۔ اور غاث اللہ البلاد یُغیثها غیثا، اور غِیثتِ الارض تغاث غیثاً فهی ارض مَغیثة مغیوثه، تو یغاث الناس کا معنی ہوگا ان پر بارش برسائی جائے گی۔ فِيهِ يَعْصِرُونَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ انگور اور تیل نچوڑیں گے، امام بخاری نے اس کو ذکر کیا ہے۔ حجاج نے ابن جریج سے روایت کیا: وہ انگور کو بطور شراب، تل اور زیتون کو بطور تیل نچوڑیں گے۔ ایک قول یہ ہے: دودھ دھونا مراد ہے (اس کو نچوڑنے کے قول کے ساتھ ذکر کرنا) اس کی کثرت کی وجہ سے ہوگا۔ اور یہ نباتات کی کثرت پر دلالت ہے۔ ایک قول یہ ہے: يَعْصِرُونَ سے مراد ہے کہ وہ نجات پائیں گے اس صورت میں یہ العصرۃ سے مشتق ہوگا۔ ابوعبیدہ نے کہا: ''العصر'' ص کی حرکت کے ساتھ ملجاء و منجاء کو کہتے ہیں۔ اسی طرح العصرۃ بھی ہے۔ ابوزبید نے کہا:

صَادِيًا يَسْتَغِيثُ غَيْرَ مُغَاثٍ ولقد كَانَ عُصْرَةَ المنجودِ (1)

المنجود سے مراد فزع ہے اور اعتصرت بفلان و تعصرت یعنی میں نے اس کی پناہ لی۔ ابو الغوث نے کہا: يَعْصِرُونَ سے مراد يَسْتَغِلُّونَ ہے کہ وہ غلہ حاصل کریں گے اس صورت میں یہ عصر العنب سے مشتق ہوگا۔ اور اعتصرت مالہ سے مراد یہ ہوگا کہ میں نے اس کے قبضہ سے اس کو نکالا۔ عیسیٰ نے تُعْصَرُون پڑھا ہے یعنی تا کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ، معنی ہوگا: تم پر بارش برسائی جائے گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ (النباء) اور یہی معنی ہوگا تُعْصِرُونَ کا یعنی تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 276

رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''(یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا: (فوراً) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا: لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے پوچھو کہ حقیقت حال یہ تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ، بے شک میرا پروردگار تو ان کے مکر (وفریب) سے خوب آگاہ ہے۔ بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا: کیا معاملہ ہوا تمہارا جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا اس سے مطلب براری کے لیے (بیک زبان) بولیں: حاشاللہ! انہیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرہ برائی، عزیز کی بیوی (کو یارائے ضبط نہ رہا) کہنے لگی: اب تو آشکار ہو گیا حق میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا اپنی مطلب براری کے لیے بخدا وہ تو سچا ہے''۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ یعنی قاصد گیا اور بادشاہ کو خبر دی تو بادشاہ نے کہا: ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ یعنی اس نے آپ کو نکلنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا: ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ یعنی عورتوں کی حالت الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ تو آپ نے نکلنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ بادشاہ کے نزدیک آپ کی برأت ثابت ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ آپ بغیر جرم کے قید میں رہے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن اسحاق بن ابراہیم ہیں''(1)۔ آپ نے فرمایا: ''اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے، پھر مجھے قاصد بلانے آتا تو میں اس کے بلانے پر چلا جاتا''۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ۔

آپ نے فرمایا: ''اور اللہ کی رحمت ہو لوط علیہ السلام پر انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی جب انہوں نے کہا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (ہود) پس ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا وہ اپنی قوم میں سے اعلیٰ ترین خاندان سے مبعوث فرمایا''۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا(2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی اور اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (بقرہ: 260) کیا تو ایمان نہیں رکھتا آپ نے کہا: کیوں نہیں لیکن (میں نے ایسا اس لیے کیا) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے آپ صبر کرنے والے، بردبار تھے اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 680

جتنی آپ رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور (اپنے بے قصور ہونے کے) عذر تلاش نہ کرتا''۔
اسی طرح کی حدیث عبدالرحمٰن بن قاسم جو امام مالک کے ساتھی ہیں ان کی سند سے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں مروی ہے، اور دیوان میں ابن قاسم کی اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں۔ طبری کی روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام پر رحم فرمائے اگر میں قید ہوتا پھر میری طرف قاصد بھیجا جاتا تو میں جلدی جلدی نکلتا، حضرت یوسف علیہ السلام بردبار اور پرسکون طبیعت کے مالک تھے'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور ان کے کرم پر تعجب ہوتا ہے اللہ ان کی مغفرت کرے جب ان سے گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا، اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو بالکل جواب نہ دیتا اور یہ شرط رکھتا کہ (پہلے) وہ مجھے قید خانے سے نکالیں اور مجھے ان پر تعجب ہوتا ہے جب ان کے پاس قاصد آیا، اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو میں دروازے کی طرف جلدی کرتا''۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فعل اطمینان اور صبر تھا اور گھر کی براءت کا مطالبہ تھا، روایت کے مطابق اس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ آپ نکلیں، بادشاہ کے ہاں مقام و مرتبہ حاصل کر لیں اور وہ درگزر کرتے ہوئے آپ سے جرم سے خاموشی اختیار کر لے تو لوگ ہمیشہ اسی آنکھ سے آپ کو دیکھتے رہیں گے اور کہتے رہیں گے: یہ ہے وہ جس نے اپنے آقا کی بیوی کو بہلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ آپ اپنی براءت کو واضح کر دیں اور پاکدامنی اور بھلائی میں سے اپنے مقام و مرتبہ کو ثابت کر دیں اور اس وقت آپ مقام و مرتبہ کے لیے نکلیں گے، پس اس وجہ سے آپ نے قاصد کو کہا: اپنے مالک کے پاس لوٹ جاؤ اور اسے کہہ کہ عورتوں کا کیا معاملہ ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد صرف یہ تھا کہ تو اس کو کہہ کہ میرے جرم کو دیکھ اور میرے معاملہ میں غور و فکر کر کہ کیا تو نے حق کے ساتھ قید کیا یا ظلم کے ساتھ اور آپ نے عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا یا تو یہ آپ کی حسن معاشرت ہے یا پھر عزیز کی مذمت کے حوالے سے اس کی رعایت فرماتے ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر، اناءت اور جلدی نہ نکلنے کی تعریف کیسے فرمائی حالانکہ اپنے آپ کو اس مقام سے ہٹا لیا جس مقام کی وجہ سے آپ نے ان کی تعریف فرمائی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ایک اور رائے اختیار فرمائی اس میں بھی عمدگی موجود ہے آپ فرماتے ہیں: اگر میں ہوتا تو نکلنے میں جلدی کرتا، پھر اس کے بعد میں نے اپنا عذر پیش کیا، اور وہ یہ ہے کہ یہ قصص اور واقعات اس لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ قیامت تک کے لیے لوگ ان کی اقتدا کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو زیادہ محتاط بات پر ابھارنا چاہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات میں احتیاط کو چھوڑنا بعض اوقات قید میں رہنے ہی کو لازم کر دیتا ہے اور اس کے قید سے نکلنے کی صورت کو دوبارہ ختم بھی کر سکتا ہے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی وجہ سے اس سے امن حاصل تھا جبکہ آپ کے علاوہ دیگر لوگوں کو یہ امن حاصل نہیں ہوتا تو وہ حالت جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو بیان فرمایا وہ احتیاط کی حالت ہے اور جو کچھ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا وہ بہت بڑا صبر ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ آپ نے تمام عورتوں کا ذکر کیا تاکہ کنایۃً ان میں عزیز کی بیوی بھی داخل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 279

ہو جائے اور صراحتاً اس کا ذکر نہ ہو یہ آپ کا حسن معاشرت ہے۔ کلام میں حذف ہے اصل میں فاسألہ أن یتصرف ماباال النسوۃ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بادشاہ نے عورتوں اور عزیز مصر کی طرف پیغام بھیجا۔ عزیز مصر فوت ہو چکا تھا۔ پس اس نے انہیں بلایا قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اور کہا: تمہارا معاملہ کیا ہے۔ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عورتوں میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اپنی مطلب براری کے لیے کہا تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے یا پھر ہر ایک کے قول سے مراد یہ ہے کہ عزیز کی بیوی نے ظلم کیا تو یہ ان عورتوں کی طرف سے مطلب براری ہی تھا۔ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی معاذ اللہ۔ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ، سُوْٓءٍ سے مراد زنا ہے قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ جب اس نے عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کا اقرار کرتے دیکھا اور اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ انکار کی صورت میں عورتیں اس کے خلاف گواہی دیں گی تو اس نے بھی اقرار کر لیا۔ اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔ حَصْحَصَ الْحَقُّ یعنی واضح اور ظاہر ہو گیا۔ اس کی اصل حصص ہے ایک قول یہ ہے: اصل حَصْحَصَ ہی ہے جس طرح کبکبوا کے بارے میں کُبْكِبُوْا اور کفف کے بارے میں کفکف ہے، یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ الحص کی اصل کسی چیز کا استیصال ہے۔ حص شعرہ کہا جاتا ہے جب وہ اس کو جڑ سے اکھیڑ دے۔

ابو قیس بن الاسلت نے کہا:

قد حَصَّتِ البيْضَةُ رأسِي فَمَا أطْعَمُ نومًا غيرَ تَهْجاعِ

اور سَنَةٌ حصاء سے مراد ایسا سال ہے جس میں بھلائی نہ ہو۔ جریر نے کہا:

يأوِي إليكم بلَامَنٍّ ولا جَحَدٍ مَن ساقه السَّنَةُ الحَصَّاءُ والذِّيبُ

شاعر نے گویا کہ ''الضبع'' کہنا چاہا ہے، اور اس سے مراد قحط زدہ سال ہے؛ قافیہ کی وجہ سے ان کی جگہ ''الذیب'' کو ذکر کر دیا ہے۔ حَصْحَصَ الْحَقُّ کا معنی یہ ہے کہ حق اپنے ظاہر اور ثابت ہونے کی وجہ سے باطل سے جدا ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

أَلَا مُبْلِغٌ عنِّي خِدَاشًا فإنَّهُ كذوبٌ إذا ما حَصْحَصَ الحقُّ ظالمُ

ایک قول یہ ہے: یہ حصۃ سے مشتق ہے معنی یہ ہو گا: حق کا حصہ باطل سے جدا ہو گیا۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: اس کی اصل عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے، حصَّ شعرہ جب اسے جڑ سے اکھیڑ لیا گیا ہو، اسی سے الحصۃ من الأرض ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اسے کاٹ لیا جائے اور الحصحص کسرہ کے ساتھ مٹی اور پتھر کو کہتے ہیں، جوہری نے یہ ذکر کیا ہے۔ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یہ بھی عزیز کی بیوی کا قول ہے اگرچہ اس سے اس کے بارے میں پوچھا نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ بات توبہ کے اظہار کے لیے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی اور کرامت کو ثابت کرنے کے لیے کی، کیونکہ اقرار کرنے والے کا اپنے خلاف اقرار کرنا اس کے خلاف دی جانے والی شہادت کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے شہادت اور اقرار دونوں کو جمع کر دیا تاکہ گمان کسی آدمی کی عقل کو نہ ڈھانپ لے اور نہ ہی اس میں شک کی آمیزش ہو۔ خَطْبُكُنَّ اور رَاوَدْتُّنَّ میں نون کے مشدد ہونے کی وجہ یہ ہے

کہ یہ مذکر میں پائی جانے والی میم اور واؤ کی طرح ہے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآىِٕنِيْنَ ۝ وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''یہ میں نے اس لیے کہا تھا تا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں خیانت نہیں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو۔ اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا۔ بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمادے، یقیناً میرا رب غفور رحیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بات کس نے کہی، ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کی گفتگو میں سے ہے اور یہ اس کے قول الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ کے ساتھ متصل ہے یعنی اس نے کہا کہ میں نے سچائی کا اقرار کیا تا کہ وہ جان لے کہ میں نے غیب میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی یعنی اس کے خلاف جھوٹ نہیں بولا اور اس کی عدم موجودگی میں برائی کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ میں نے سچ بولا اور خیانت سے نکل گئی پھر اس نے کہا: وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ بلکہ میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا؛ اسی بنیاد پر وہ صانع کا اقرار کر رہی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کہا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ قاصد کو واپس لوٹانے والا جو کام میں نے کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے تا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ یہ حسن، قتادہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ بِالْغَيْبِ کا معنی وھو غائب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ گفتگو بادشاہ کی موجودگی میں کی اور فرمایا: لِيَعْلَمَ (غیب کا صیغہ استعمال کیا) اس سے مقصود بادشاہ کی توقیر و احترام تھا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے یہ گفتگو اس وقت کی جب قاصد دوبارہ آپ کے پاس آیا اور آپ ابھی قید خانہ میں تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس خبر لے کر آیا، اور جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے؛ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآىِٕنِيْنَ یعنی میں نے اپنے آقا کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا: اے یوسف! (اس وقت بھی آپ نے خیانت نہیں کی) جب آپ نے چادر کھولی اور اس طرح بیٹھے جس طرح مرد (اپنی) عورت کے پاس بیٹھتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ الآیۃ۔ سدی نے کہا: عزیز کی بیوی نے آپ کو کہا کہ اس وقت بھی خیانت نہیں کی جس وقت اے یوسف! تو نے اپنی سروال اتار دی تھی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (☆) اور ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے؛ یعنی یہ اس وجہ سے ہوا تا کہ یوسف جان لے

☆ ایسی روایات کے بارے میں تبصرہ گزر چکا ہے۔ مترجم

کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی، اور میں اس کی امانت پر اسے انعام و جزا دینے سے غافل نہیں ہوا۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآىِٕنِیْنَ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ان کے فریب کے ہوتے ہوئے ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ایک قول یہ ہے: یہ عورت کی گفتگو کا حصہ ہے۔ قشیری نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اور وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب یہ احتمال ہے کہ یہ عورت کے کلام میں سے ہو تو پھر اس احتمال پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تاکہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کو چادر اور سروال کھولنے سے بری قرار دیں اور جب ہم اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا کلام سمجھیں گے تو پھر یہ ان امور میں سے ہوگا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں آئے تھے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے وَ هَمَّ بِهَا (یوسف: 24) کے متعلق مختار قول گزرا ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: بعض لوگوں نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک عزیز کی بیوی کی گفتگو کا حصہ ہے، کیونکہ یہ اس کے قول اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ کے ساتھ متصل ہے۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کی نفی کرتے ہیں۔ پس جس نے ان کے قول پر بناء کی ہے اس نے کہا: قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک کا کلام متصل ہے اور اس میں فی الحقیقت وقف تام نہیں ہے۔ ہم (قرطبی) نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس جانب گئے ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ تو اللہ کے نبی کو اپنے ہی نفس کا تزکیہ اچھا نہ لگا تو فرمایا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کیونکہ اپنے ہی نفس کا تزکیہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النجم: 32) اپنے آپ کو پاک و طاہر قرار نہ دو۔ ہم (قرطبی) نے اس کو سورۃ ''النساء'' میں بیان کر دیا ہے ایک قول یہ ہے: یہ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بدگمانی سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دیتا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یعنی اس میں برائی کی خواہش ہوتی ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور مَا بمعنی من ہے یعنی الا من رحم ربی جس پر میرا رب رحم فرمائے تو وہ اس سے بچ جاتا ہے۔ اور مَا کا بمعنی من استعمال ہونا کثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: 3) یہاں بھی بمعنی من ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے، کیونکہ یہ نفس امارہ کے زنا سے بچنے کے ذریعے رحم کیے جانے کی استثنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے ایسے ساتھی کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ اگر تم اس کی عزت کرو، اطاعت کرو اور اسے کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں برائی کی انتہا تک لے جائے اور اگر تم اس کی اہانت کرو، اسے ننگا کرو اور اس کی مخالفت کرو تو وہ تمہیں بھلائی کی انتہا تک لے جائے''۔ ان (صحابہ) نے کہا: یا رسول اللہ! یہ زمین میں برا دوست ہے، آپ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ تمہارے ان نفوس کا دوست ہے جو تمہارے پہلوؤں میں ہیں۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا

مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿٥٤﴾

’’اور بادشاہ نے حکم دیا کہ لے آؤ اسے میرے پاس میں چن لوں گا اسے اپنی ذات کے لیے، پھر جب اس نے آپ سے گفتگو کی (اور مطمئن ہو گیا) تو کہا: آپ آج سے ہمارے ہاں بڑے محترم (اور) قابل اعتماد (درباری) ہیں‘‘۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ جب بادشاہ کے سامنے آپ کی برأت ثابت ہوگئی، اس واقعہ میں آپ کی امانت متحقق ہوگئی اور وہ آپ کے صبر اور حوصلے کو بھی پہچان گیا تو اس کے نزدیک آپ کا مقام بڑھ گیا اور اسے آپ کی دوستی کی عمدگی کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا: ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ بادشاہ کی گفتگو کو ملاحظہ کرو کہ جب آپ کا علم ثابت ہوا تو اس نے صرف ائْتُوْنِيْ بِهٖ کہا اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دوبارہ یہ معاملہ کیا تو اس نے ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ کہا۔ حضرت وہب بن منبہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا گیا تو آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: مخلوق میں سے مجھے میرا رب کافی ہے، اس کا پڑوس عزت والا ہے، اس کی تعریف اعلیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر آپ داخل ہوئے، جب بادشاہ نے آپ کی طرف دیکھا تو اپنے تخت سے نیچے اترا اور آپ کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑا پھر بادشاہ نے آپ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور کہا: اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ حضرت یوسف نے اسے کہا: اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ یعنی خزانوں کی (حفاظت کرنے والا) عَلِيْمٌ اس کے اندر تصرف کے طریقوں کو (جاننے والا)۔ ایک قول یہ ہے: حساب کو یاد کرنے والا، زبانوں کو جاننے والا۔ حدیث میں ہے: ’’اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو اسی وقت وہ آپ کو بنا دیتا لیکن اس نے اس معاملہ کو ایک سال تک مؤخر کر دیا‘‘۔ ایک قول یہ ہے: آپ کی ملکیت کو ایک سال تک اس لیے مؤخر کیا گیا کہ آپ نے اِن شاء اللہ نہ کہا۔ اور اس واقعہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پاس گئے تو آپ نے کہا: یا اللہ! اس کی بھلائی میں سے میں تیری بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور اس کے شر اور دیگر لوگوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، پھر آپ نے بادشاہ کو عربی میں سلام کیا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے پھر آپ نے اسے عبرانی میں بلایا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے باپ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی زبان۔ بادشاہ ستر زبانوں میں گفتگو کرتا تھا تو جب بھی بادشاہ کسی زبان میں گفتگو کرتا حضرت یوسف علیہ السلام اسے اسی زبان میں جواب دیتے تو بادشاہ آپ کی اس صورتحال سے متعجب ہوا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ پھر اس نے آپ کو اپنے تخت پر بٹھایا اور کہا: میں آپ سے اپنا خواب سننا چاہتا ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ہاں اے بادشاہ! تو نے سات موٹی تازہ چمکدار گائیں دیکھیں۔ آپ کے سامنے دریائے نیل کو ان سے ظاہر کر دیا گیا وہ نیل کے کنارے سے تیرے پاس آئیں ان کے تھن دودھ سے بہہ رہے تھے اسی دوران تو نے ان کی طرف دیکھا اور ان کی خوبصورتی سے تو حیران ہوا۔ اس دوران نیل کا پانی جذب ہو گیا اور اس کی خشکی ظاہر ہوگئی تو اس کے کیچڑ سے سات دبلی پتلی گائیں نکلیں جن کے بال بکھرے ہوئے، پراگندہ اور پیٹ سکڑے ہوئے تھے، ان کی نہ کوئی کھیریاں

تھیں اور نہ ہی تھن۔ ان کے دانت داڑیں تھیں اور کتے کے پاؤں جیسے پاؤں تھے اور سونڈ درندوں جیسے تو وہ موٹی تازہ گائیوں کے ساتھ مل گئیں انہوں نے انہیں درندوں کی طرح چیر اپھاڑا، ان کے گوشت کھا گئیں، ان کی جلدوں کو پھاڑ دیا، ان کی ہڈیوں کو انہوں نے توڑ دیا اور ان کے دماغ نکال دیئے اس دوران تو ان کو دیکھتا رہا اور حیران ہوا کہ انہوں نے کیسے غلبہ حاصل کر لیا حالانکہ وہ کمزور ہیں؟ پھر ان میں کوئی موٹا پا ظاہر نہ ہوا اور نہ ہی انہیں کھانے کے بعد ان میں کوئی اضافہ ہوا۔

سات سرسبز و شاداب اور نرم و نازک خوشے تھے جو دانوں اور پانی سے بھرے ہوئے تھے، ان کی دوسری جانب سات خشک خوشے تھے جن میں نہ کوئی پانی تھا اور نہ ہی شادابی، ان کی ٹہنیاں مٹی اور پانی میں تھیں اسی دوران تو اپنے آپ سے کہتا ہے: یہ کون سی چیز ہے؟ یہ شاداب پھل ہیں اور وہ سیاہ خشک جبکہ ان کا اگنے والا تنا ایک ہی ہے، ان کی جڑیں پانی میں ہیں، تب ہوا چلی تو اس نے سیاہ خشک پتوں کو شاداب پھلدار پتوں پر ڈال دیا تو ان میں آگ بھڑک اٹھی تو اس نے انہیں جلا دیا تو وہ سیاہ راکھ بن گئے تو اے بادشاہ! تو خوف زدہ ہو کر بیدار ہو گیا، بادشاہ نے کہا: اللہ کی قسم! اس کی حقیقت کیا ہے اگرچہ یہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھی جو میں نے آپ سے سنی اے صدیق! میرے خواب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تو کھانا جمع کرے گا اور ان شاداب سالوں میں بہت زیادہ کھیتی کاشت کرے گا، اگر تو کسی پتھر یا کیچڑ پر کاشت کرے گا تو وہ بھی اگے گا اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ بڑھوتری اور برکت ظاہر فرمائے گا پھر تو ان خوشوں سے فصل اٹھائے گا اس کے لیے بڑے بڑے بھڑولے بنائے جائیں گے؛ تو خوشے اور پودے جانوروں کا چارہ بنیں گے جبکہ دانے لوگوں کے لیے ہوں گے، تو لوگوں کو حکم دے گا، وہ اپنے کھانے میں سے تیرے بھڑولوں میں پانچواں حصہ پہنچائیں گے تو جو کھانا تو جمع کرے گا وہ تمام شہر والے لوگوں اور ارد گرد رہنے والے لوگوں کے لیے کافی ہو گا گرد و نواح سے لوگ تیرے پاس آئیں گے اور تجھ سے لے کر جائیں گے اور تیرے پاس اتنا خزانہ جمع ہو جائے گا کہ تم سے پہلے کسی کے پاس بھی جمع نہیں ہوا ہو گا۔ تو بادشاہ نے کہا: ان امور کی تدبیر کون کرے گا؟ اگر سب شہر والوں کو جمع کیا جائے تو وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ اس سلسلہ میں امانت سے کام لینے والے نہیں، تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ۔ خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ سے مراد علی خزائن ارضك ہے یہ خزانة کی جمع ہے اور اضافت کے عوض اس پر الف، لام آیا ہے، جس طرح نابغہ کا قول ہے:

لَهُمْ شِيمَةٌ لم يُعْطِهَا الله غَيْرَهُمْ مِنَ الْجُودِ وَالْأَحْلَامُ غَيْرُ كَوَاذِبِ

(والاحلام اصل میں احلامہ ہے تو اضافت کے عوض احلام پر الف لام آیا ہے۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ قید خانے میں جاری ہوا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے پاس کیا گیا ہو پھر اس نے دوسری مجلس میں ائْتُوْنِیْ بِهٖ تاکیداً کہا ہو۔ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ یعنی میں اس کو اپنے لیے خالص بنا لوں گا، اپنی مملکت کے امور اس کے سپرد کروں گا۔ تو وہ گئے اور آپ کو لے آئے۔ اس بات پر فَلَمَّا كَلَّمَهٗ دلالت کرتا ہے، یعنی بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام

کے ساتھ کلام کیا اور آپ سے خواب کے بارے میں پوچھا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا، قَالَ بادشاہ نے کہا: اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ مکین سے مراد متمکن ہے جس کا قول نافذ ہو "امین" تجھے دھوکے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

"آپ نے فرمایا: مجھے مقرر کردے زمین کے خزانوں پر بے شک میں (ان کی) حفاظت کرنے والا (اور معاشی مسائل کا) ماہر ہوں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ حضرت سعید بن منصور نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے سنا ہے: مصر زمین کا خزانہ ہے؛ جہاں تک اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ کا تعلق ہے تو اس میں حذف ہے یعنی اجعلنی علی حفظ خزائن الارض مضاف کو حذف کردیا گیا۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ یعنی جو میرے سپرد کیا جائے گا میں اس کی حفاظت کرنے والا ہوں گا عَلِيْمٌ اس کے معاملات کو جاننے والا ہوں۔ تفسیر میں ہے: میں حساب کرنے والا اور لکھنے والا ہوں، اور آپ سب سے پہلے آدمی تھے جس نے کاغذوں میں لکھا۔ ایک قول یہ ہے: حَفِيْظٌ خوراک کے اندازے کو عَلِيْمٌ خوشحالی کے سالوں کو۔ جویبر نے ضحاک عن حضرت ابن عباس کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ نے اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ نہ کہا ہوتا تو وہ اسی وقت آپ کو یہ عہدہ سونپ دیتا لیکن اس نے یہ عہدہ آپ سے ایک سال مؤخر کردیا (1)۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: امارت کا سوال کرنے والے دن سے جب سال گزرا تو بادشاہ نے آپ کو بلایا۔ آپ کی طرف متوجہ ہوا، آپ کو قلادہ پہنایا، آپ کے لیے سونے کا تخت بچھایا گیا جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، آپ کو استبرق کا حلہ پہنایا گیا، چارپائی کی لمبائی تیس ذراع اور چوڑائی دس ذراع تھی، اس پر تیس بستر اور ساٹھ تکیے تھے پھر اس نے آپ کو نکلنے کا حکم دیا تو آپ جھومتے ہوئے نکلے، آپ کا رنگ برف کی طرح (سفید) اور چہرہ چاند کی طرح تھا، دیکھنے والا آپ کے چہرے کی رنگت کی صفائی سے اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا، آپ تخت پر براجمان ہوئے، بادشاہ آپ کے قریب ہوئے اور بادشاہ عورتوں کے ساتھ آپ کے کمرہ میں داخل ہوا، مصر کی شاہی اس نے آپ کے سپرد کی اور قطفیر اپنے عہدے سے الگ ہوگیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی جگہ لی۔ ابن زید نے کہا: مصر کے بادشاہ فرعون کے پاس کھانے کے علاوہ بہت سارے خزانے تھے، بادشاہ نے وہ سارے خزانے آپ کے سپرد کردیئے اور ان راتوں میں قطفیر ہلاک ہوگیا، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی راعیل سے شادی کرلی جب آپ اس کے پاس گئے تو آپ نے کہا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں جو تو چاہتی تھی؟ اس نے کہا: اے صدیق! مجھے ملامت نہ کرو، میں حسین وجمیل اور نرم ونازک عورت تھی جس طرح کہ آپ نے دیکھا، اور میرا شوہر عورتوں کے پاس نہیں آتا تھا اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے حسن عطا فرمایا اس کی وجہ سے میرا نفس مجھ پر غالب آگیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے باکرہ پایا، اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 9

کے قریب گئے تو اس سے دو بچے پیدا ہوئے: افراثیم بن یوسف اور منشا بن یوسف۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا جو کہ عزیز مصر کی بیوی تھی کے ساتھ بھائیوں کے کہنے پر ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ زلیخا، کا شوہر مر گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تھے، اس کا مال ضائع ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے روتے روتے اس کی بینائی جاتی رہی، لوگ اس سے دور ہو گئے، بعض اس پر رحم کرتے اور بعض رحم نہ کرتے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی قوم کے ایک لاکھ لوگوں کے ساتھ ہر ہفتے کچہری لگاتے۔ زلیخا کو کہا گیا کہ تو اپنی بات ان کے سامنے بیان کرنا شاید آپ تیرا مسئلہ حل کر دیں، پھر اسے کہا گیا: ایسا مت کرنا، ہو سکتا ہے تیری طرف سے جو بہلاوا اور قید والا معاملہ ہوا تو وہ انہیں یاد آ جائے تو وہ تیرے ساتھ ناروا سلوک کریں گے۔ زلیخا نے کہا: میں اپنے حبیب کے اخلاق کو جانتی ہوں۔ پھر زلیخا نے آپ کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب آپ کچہری میں بلند جگہ پر کھڑے ہوئے تو اس نے باآواز بلند ندا دی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ کون ہے؟ اس کو لے آؤ۔ وہ بولی: میں وہی ہوں جو آپ کی خدمت کرتی تھی، آپ کے بال سنوارتی تھی، میں نے اپنے گھر میں آپ کی تربیت کی، آپ کو عمدہ طریقے سے ٹھہرایا لیکن مجھ سے جہالت کی وجہ سے وہ زیادتی ہو گئی جو ہوئی۔ سو میں نے اپنے کیے کی مصیبت کو پالیا، میرا مال ضائع ہو گیا، میری ذلت و رسوائی کا سلسلہ دراز ہو گیا، بصارت چلی گئی، ان میں سے کوئی میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے اور کوئی مہربانی نہیں کرتا۔ اور یہ مفسدین کی جزا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بہت سخت روئے۔ پھر آپ نے اسے فرمایا: کیا تیرے دل میں میری محبت میں سے کچھ باقی ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھے اپنے گھوڑے کا اگلا حصہ پکڑا دیں۔ آپ نے اسے وہ پکڑا دیا، اس نے اسے اپنے سینے پر رکھ دیا، تو آپ نے زلیخا کے دل کی دھڑکن کی حرکت اور ارتعاش کو اپنے ہاتھ میں محسوس کیا، آپ روئے پھر آپ اپنے مقام پر تشریف لے گئے اور زلیخا کی طرف ایک قاصد بھیجا، اگر تو بغیر شوہر کے ہے تو ہم تیرے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور اگر تو شوہر والی ہے تو ہم تجھ سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اس نے قاصد کو کہا: میں اللہ کی پناہ میں آتی ہوں اس بات سے کہ بادشاہ میرے ساتھ مذاق کرے! انہوں نے میری جوانی، میری غنا، میرے مال اور عزت کے ہوتے ہوئے مجھے نہیں چاہا تو آج جب کہ میں بوڑھی، اندھی اور فقیر ہو چکی ہوں تو وہ مجھے کیسے چاہیں گے؟ قاصد نے آپ کو اس کی گفتگو سے آگاہ کیا، جب اگلے ہفتے آپ تشریف لائے تو اس نے آپ کو پھر پکارا۔ تو آپ نے فرمایا: کیا قاصد نے تجھے پیغام نہیں پہنچایا؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ آپ نے اس کے معاملات کی اصلاح کی اور شادی کر لی۔ پھر اس نے آپ کے ساتھ شب زفاف گزاری، حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، وہ بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہو گئی، آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی جوانی، حسن و جمال اور بصارت کے لوٹانے کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا شباب اور حسن و جمال واپس لوٹا دیا حتیٰ کہ وہ بہلاوے والے دن سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے حضرت

یوسف علیہ السلام کے اللہ کے محارم سے بچنے کے صلہ میں یہ اکرام فرمایا۔ آپ نے اس کے ساتھ جماع کیا اس حال میں کہ وہ کنواری تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے (گزشتہ معاملات کے متعلق) پوچھا تو اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! میرا شوہر نامرد تھا، عورتوں کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا تھا اور آپ بے مثال حسن و جمال والے تھے۔

پھر دونوں نے بڑی ہی خوبصورت زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ ہر روز ان کے لیے بھلائی کو تازہ فرماتا، پھر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے دو بچے پیدا کیے۔ ایک افراثیم اور دوسرا منشاء۔ اور روایت ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا سے بھی دوگنی محبت زلیخا کی پیدا کر دی۔ آپ نے اسے فرمایا: تجھے کیا ہوا ہے کہ تو میرے ساتھ اس طرح محبت نہیں کرتی جس طرح پہلے کرتی تھی؟ تو اس نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذائقہ چکھا ہے تو اس نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض اہل علم نے کہا: اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ ایک فاضل آدمی فاجر آدمی اور کافر بادشاہ کی طرف سے کوئی ذمہ داری سرانجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اسے کوئی کام سپرد نہیں کرے گا جو وہ نہیں کرنا چاہتا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق معاملات کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کام اس فاجر کے اختیار اس کی خواہش اور اس کے فجور کے مطابق ہوا تو یہ جائز نہیں ہوگا اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے اور آج کے زمانے میں کسی کے لیے جائز نہیں، بہرحال پہلی صورت بہتر ہے بشرطیکہ اس شرط کے مطابق ہو جو ذکر کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ ماوردی نے کہا: اگر بادشاہ ظالم ہو تو پھر اس کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے حوالے سے دو طرح کا اختلاف ہے۔

(۱) ولایت کو قبول کرنے کا جواز بشرطیکہ امور مفوضہ میں حق کے مطابق کرے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون کی طرف سے والی بنے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے حق میں اس کا دنیاوی فعل معتبر ہوگا نہ کہ کسی اور کا۔

(۲) یہ جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں ظالموں کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا ان کی معاونت کرنے اور ان کے اعمال کو درست سمجھنے کے مترادف ہے ان کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی فرعون کی طرف سے ولایت کے قبول کرنے کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون نیک سیرت آدمی تھا، اور سرکش فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی املاک کو دیکھا نہ کہ اس کے اعمال کو لہٰذا آپ کی طرف سے اس کی متابعت کا معاملہ نہ رہا۔ ماوردی نے کہا ہے: ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے معاملہ میں ان دونوں قولوں کے اطلاق کے بجائے تفصیل کو بیان کرنا زیادہ صحیح ہے اور اس کی تین اقسام بنتی ہیں۔

نمبر 1۔ ایسے معاملات کہ جن کا نفاذ بغیر کسی اجتہاد کے جائز ہوتا ہے جیسے زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ تو ان میں ظالم کی طرف سے ولایت جائز ہوگی۔ اس کے مستحق پر نص نے اس میں اجتہاد سے مستغنی کر دیا ہے۔

نمبر 2۔ وہ معاملات جن میں کسی کے لیے علیحدگی اختیار کرنا ممکن نہ ہو اور جن کے مصارف میں اجتہاد لازم آتا ہو جیسے

مال فئی وغیرہ تو ان معاملات میں ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں وہ بغیر حق کے تصرف کرے گا اور ایسے معاملات میں پڑے گا جن کا وہ استحقاق نہیں رکھتا۔

نمبر 3۔ وہ امور جن کو وہ تفویض کر سکتا ہو اور ان میں اجتہاد کا عمل دخل بھی ہو جیسے قضایا اور احکام تو اگر نظر و فکر دو باہم رضا مند آدمیوں کے درمیان فیصلے کی تنفید کے بارے میں ہو اور دو مجبور آدمیوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کے طور پر ہو تو جائز ہے اور اگر بالجبر کوئی معاملہ لازم کرنا مقصود ہو تو پھر جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت کریمہ میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی جس کام کا اہل ہو اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: امام مسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا(1): ''اے عبدالرحمٰن! امارت کا سوال نہ کر، اگر تیرے سوال کی وجہ سے تجھے امارت دی گئی تو تجھے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر بغیر سوال کے تجھے ملی تو اس پر تیری مدد کی جائے گی۔'' حضرت ابی بردہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میرے ساتھ دو اشعری آدمی تھے، ان میں سے ایک میری دائیں جانب تھا جبکہ دوسرا بائیں جانب تو ان دونوں نے کسی عہدہ کا سوال کیا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک فرما رہے تھے آپ نے فرمایا: ''اے ابو موسیٰ یا (آپ نے فرمایا) اے عبداللہ بن قیس! تو کیا کہتا ہے؟ حضرت ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! انہوں نے مجھے اپنی دل کی بات سے آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ عہدہ کے طالب ہیں۔ آپ نے فرمایا: گویا میں آپ کی مسواک کو آپ کے ہونٹ کے نیچے دیکھتا ہوں کہ اسے دبا دیا گیا، آپ نے فرمایا: ''ہم ایسے آدمی کو عہدہ نہیں دیتے جو عہدہ لینا چاہے''۔ حضرت ابو موسیٰ نے پوری حدیث کو ذکر کیا، امام مسلم وغیرہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ولایت کا مطالبہ اس وجہ سے کیا کہ آپ کو علم تھا کہ عدل، اصلاح اور فقراء کو ان کے حقوق دینے کے حوالے سے کوئی بھی ان کی طرح نہیں تھا تو آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ آپ پر فرض ہے کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ اور ایسا کوئی نہیں تھا، آج بھی یہی حکم ہے (یعنی اگر ایسی صورت ہو تو مطالبہ جائز ہے) اگر کوئی آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ قضاء و حساب میں حق کو قائم رکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جو اصلاح کر سکے اور اس کے قائم مقام ہو سکے تو یہ کام اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ والی بنے اور اس کا مطالبہ کرے، اور علم و فضل میں جن اوصاف کے سبب وہ اس کا مستحق ہے ان کے بارے بتائے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اور اگر وہاں کوئی ایسا آدمی ہو جو حق کو قائم کر سکتا ہے اور ان امور کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس آدمی کو بھی علم ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ مطالبہ نہ کرے اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جو آپ نے حضرت عبدالرحمن کو فرمایا: ''امارت کا سوال نہ کرو'' کیوں کہ ایسی صورت میں اس کا مطالبہ، اس میں پائی جانے والی آفات کی کثرت کے جاننے کے باوجود اس عہدہ کا لالچ اور اس سے چھٹکارا کے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا، جلد 2، صفحہ 120

حصول کا مشکل ہونا، اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے اور ذاتی اغراض کے لیے مطالبہ کر رہا ہے۔ جس آدمی کی کیفیت یہ ہو ممکن ہے اس پر اس کا نفس غالب آ جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؛ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''اس کو اس کے سپرد کر دیا جائے گا'' کا یہی معنی ہے۔ اور جس آدمی نے اس کی آفات کو جاننے کی وجہ سے اور حقوق میں کوتاہی کے خوف کی وجہ سے اس کا انکار کیا اور اس سے بھاگا، پھر اس کو اس میں مبتلا کر دیا گیا تو اس کے لیے اس سے چھٹکارے کی امید کی جا سکتی ہے، یہی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''اس پر اس کی مدد کی جائے گی'' کا معنی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا: میں کافی ہوں، کریم ہوں، اگرچہ آپ اس طرح تھے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کریم ابن کریم ابن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (1)'' اور نہ ہی آپ نے فرمایا: میں خوبصورت ہوں، جمال والا ہوں، بلکہ آپ نے فرمایا: اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ تو آپ نے تو حفظ وعلم کی وجہ سے مطالبہ کیا، نسب اور جمال کی وجہ سے نہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے آپ نے یہ بات اس آدمی کے سامنے کہی جو آپ کو جانتا نہیں تھا تو آپ نے اپنا تعارف کرانا چاہا، تو اس وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ (النجم: 32) سے مستثنیٰ ہو گئے۔

چوتھا جواب: آپ نے اس کو اپنے اوپر فرض متعین سمجھا کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی میں پائے جانے والے علم وفضل کے ذریعے لوگوں کے سامنے اپنی صفات کو بیان کرنا جائز ہے۔ ماوردی نے کہا: مطلقاً تمام صفات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے بلکہ صرف اسی معاملے کے ساتھ خاص ہے جو اس کو درپیش ہو یا بیان کرنے والے کے ساتھ جس کا تعلق ہو، اور اس کے علاوہ تمام صورتوں میں ممنوع ہے کیونکہ اس میں اپنا ہی تزکیہ اور دکھلاوا ہے، اور اگر اس نے اپنے سے زیادہ فضیلت والے آدمی کو ممتاز کر دیا تو یہ خود اس کی اپنی فضیلت و شرافت کے زیادہ مناسب ہوگا؛ پس حضرت یوسف علیہ السلام کو جیسا کہ آپ کے حالات میں گزر چکا ہے ضرورت نے اس اظہار کی طرف دعوت دی اور دوسری بات یہ تھی کہ اہلیت کی وجہ سے آپ کامیابی کی امید بھی رکھتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ يَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَآءُ‌ ؕ نُصِيۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ‌ وَلَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۵۶ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ۝۵۷

''یوں ہم نے تسلط (اور اقتدار) بخشا یوسف کو سرزمین مصر میں تاکہ رہے اس میں جہاں چاہے، ہم سرفراز کرتے ہیں اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر عمدہ کام کرنے والوں کا اور آخرت کا اجر (اس سے) یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیے رہے''۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ يَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَآءُ یعنی ان کو بادشاہ کے دل کے قریب کر کے اور قید سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 193

نجات دے کر ہم نے جوان پر انعام فرمایا اس انعام کے ذریعے ہم نے ان کو زمین میں تسلط و اقتدار بخشا، یعنی جس طرح وہ چاہتے تھے اسی طرح ہم نے ان کو اقتدار عطا فرمایا۔ الکیا طبری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ مباح چیز تک پہنچنے کے لیے اور جو اس میں خوشی، اصلاح اور حقوق کا حصول ہوتا ہے اس کے لیے حیلہ کے جواز پر دلیل ہے، اسی کی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص:44) ہے (اور اپنے ہاتھ میں سبز و خشک گھاس کا مٹھا پکڑ پس اس کے ساتھ مار اور حانث نہ ہو) اسی طرح ''حیلہ کے جواز'' پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ وہ روایت ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجور پیش کی تھی اور پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل آنے والی وضاحت کی بنیاد پر باطل ہے۔

(مَكَّنَّا کو لام کے بغیر اور لام کے ساتھ ذکر کرنے کی دونوں صورتیں صحیح ہیں) جیسے کہا جاتا ہے مَكَّنَّاهُ و مَكَّنَّا لَهُ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ (الانعام:6) طبری نے کہا: بڑے بادشاہ ولید بن ریان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اطفیر کی ذمہ داری پر خلیفہ مقرر کیا اور اس کو معزول کر دیا۔ مجاہد نے کہا: اس نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے ڈیڑھ سال بعد آپ کو بادشاہ بنا دیا۔ مقاتل نے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ کے ساتھ انشاء اللہ کہا ہوتا تو اسی وقت آپ کو بادشاہ بنا دیا گیا ہوتا''۔ پھر اطفیر فوت ہوا تو ولید نے آپ کی شادی اطفیر کی بیوی راعیل سے کر دی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے ساتھ دخول کیا تو آپ نے اسے باکرہ پایا۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرائیم اور منشا پیدا ہوئے اور جس کا گمان یہ ہے کہ وہ زلیخا تھی تو اس کے حوالے سے حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی تھی بلکہ جب اس نے آپ کو بھیڑ میں دیکھا تو رو پڑی پھر اس نے کہا: ''ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلام بنا دیا اور سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اطاعت کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہ بنا دیا'' تو آپ نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا پھر وہ آپ کے عیال میں رہی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا جبکہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی۔ اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ یہ وہب کی بیان کردہ بات کے برعکس ہے اس کو ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے ''واللہ اعلم'' جب بادشاہ نے مصر کی حکومت حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کی تو آپ نے لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک فرمایا اور انہیں اسلام کی دعوت دینا شروع کی یہاں تک کہ انہوں نے ایمان قبول کر لیا اور آپ نے ان میں عدل قائم فرمایا تو مرد اور عورتیں آپ کے ساتھ محبت کرنے لگے۔ حضرت وہب، حضرت سدی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: پھر سرسبز و شاداب سال آ گئے تو آپ نے زراعت کی اصلاح کا حکم ارشاد فرمایا اور کسانوں کو زراعت میں وسعت دینے کو کہا، جب غلہ حاصل ہوا تو آپ نے اسے ذخیرہ کرنے کا حکم دیا پھر آپ نے اس کے لیے گودام بنوائے اس سال ان گوداموں میں اتنا غلہ جمع ہوا کہ وہ غلہ کی کثرت کی وجہ سے تنگ پڑ گئے پھر اسی طرح ہر سال غلہ جمع ہوتا رہا یہاں تک کہ

شاداب سال گزر گئے اور قحط زدہ سال آ گئے تو جبریل امین اترے اور کہا: اے مصر والو! بھوکے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے او پر سات سال بھوک مسلط فرمادی۔ یہ بعض اہل عقل نے کہا ہے کہ بھوک اور قحط کی دو علامتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نفس عادت سے زیادہ کھانے کو پسند کرتا ہے اور پہلے کی نسبت اسے بھوک بھی جلدی لگتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ کھانا مفقود ہو جاتا ہے تو یہ دونوں علامتیں حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جمع ہو گئیں۔ مرد، عورتیں اور بچے الجوع الجوع پکارتے! کھانا کھاتے مگر سیر نہ ہوتے اور بادشاہ بھی الجوع الجوع کی صدا لگاتا۔ پھر بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے نجات بخشی پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے مصر میں یہ پیغام عام کر دیا کہ اے لوگو! کوئی آدمی بھی کھیتی کاشت نہ کرے اس طرح وہ بیج ضائع کرے گا اور کوئی چیز نہیں اگے گی اور وہ سال اتنے خطرناک آئے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب قحط کی ابتدا ہوئی تو بادشاہ کو آدھی رات کے وقت بھوک لگ گئی، تو اس نے کہا: اے یوسف! الجوع الجوع! تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ قحط کی علامت ہے۔

پھر جب قحط زدہ سالوں میں سے پہلا سال آیا تو اس میں وہ سب کچھ ختم ہو گیا جو ان لوگوں نے شاداب سالوں میں جمع کیا ہوا تھا تو اہل مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کھانا خریدنا شروع کر دیا۔ آپ نے پہلے سال انہیں کھانا نقدی کے بدلے میں بیچا یہاں تک کہ مصر میں کوئی درہم و دینار نہ بچا تو آپ نے دوسرے سال زیورات اور جواہر کے بدلے میں انہیں کھانا بیچا حتیٰ کہ لوگوں کے پاس زیورات میں سے بھی کوئی چیز نہ بچی۔ تیسرے سال آپ نے انہیں مویشیوں اور چوپایوں کے بدلے میں کھانا بیچا، یہاں تک کہ وہ بھی سارے بک گئے۔ چوتھے سال غلاموں اور لونڈیوں کے بدلے دیا اور سب پر قبضہ کر لیا۔ پانچویں سال زمین کے بدلے میں کھانا بیچا یہاں تک کہ آپ سب زمینوں کے مالک ہو گئے۔ چھٹے سال ان کے بچوں اور بیویوں کے بدلے میں انہیں کھانا دیا اور ان سب کو غلام بنا لیا اور ساتویں سال خود ان کے اپنے بدلے ان کو کھانا دیا حتیٰ کہ ساتویں سال مصر میں ہر کوئی آپ کا غلام تھا، تو لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم نے اس سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کو کہا: میرے رب کی اس قدرت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس کا اظہار اس نے میرے حوالے سے فرمایا: اب یہ سب کچھ تمہارا ہے، اس کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ بادشاہ نے کہا: میں نظام حکومت آپ کے سپرد کرتا ہوں آپ جس طرح چاہیں کریں۔ ہم آپ کے تابعدار ہوں گے اور میں آپ کی اطاعت و فرمانبرداری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں تو آپ کے غلاموں میں سے ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں نے انہیں بھوک سے اس لیے آزاد نہیں کیا تھا کہ ان کو غلام بنا لوں، میں نے ان سے مصیبت کو اس لیے نہیں ہٹایا تھا کہ میں خود ان پر مصیبت بن جاؤں، میں اللہ کو اور آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے سب مصریوں کو آزاد کیا اور ان کے مال ان کو واپس لوٹائے اور خود تیری ملکیتیں تجھ پر اس شرط کے ساتھ واپس لوٹاتا ہوں کہ تو میرے طریقے پر چلے گا۔ اور روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان سالوں میں سیر ہو کر کھانا نہ کھاتے تھے، آپ کو کہا گیا: کیا آپ بھی بھوکے ہوتے ہیں حالانکہ آپ کے قبضہ میں

(مصر کی) سرزمین کے خزانے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں گا تو بھوکے کو بھول جاؤں گا، حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہی باورچی کو فرمایا کہ وہ آپ کا کھانا نصف دن کو بنایا کرے تاکہ بادشاہ بھی بھوک محسوس کرے اور بھوکوں کو بھول نہ جائے اسی وجہ سے بادشاہوں نے نصف دن کو اپنے کھانے پکوانے شروع کیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ یعنی اپنے احسان کے ذریعے رحمت کا معنی نعمت اور احسان ہے۔ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی ان کا ثواب۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت وہب نے کہا کہ محسنین سے مراد صابرین ہیں۔ اس کی وجہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کنویں، غلامی اور قید میں صبر کرنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے محارم سے صبر کرنا جبکہ عورت نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔

ماوردی نے کہا: اس حالت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کچھ ملا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ابتلا اور آزمائش پر ثواب تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبتلا کیا تھا جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انعام فرمایا جبکہ ثواب آخرت اسی حالت پر باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ یعنی جو کچھ ہم آخرت میں دیتے ہیں وہ اس سے بہتر اور زیادہ ہے جو ہم دنیا میں عطا کرتے ہیں، کیونکہ آخرت کا اجر دائمی ہے جبکہ دنیا کا اجر ختم ہونے والا ہے آیت کا ظاہر تو ہر مومن اور متقی کے لیے عموم پر دلالت کر رہا ہے۔ انہوں نے شعر پڑھا:

أَمَا فِی رسول اللہ یوسفَ أُسْوَةٌ ۔۔۔ لمثلکَ محبوسًا علی الظُّلم والإفْکِ
أَقام جَمیلَ الصّبرِ فی الحبس بُرهةً ۔۔۔ فآل به الصّبرُ الجمیلُ إلی المُلْک

اور ان میں سے کسی نے اس کے دوست کی طرف لکھا:

وراء مَضیقِ الخوف مُتَّسعُ الأَمْنِ ۔۔۔ وأوّلِ مفروحٍ به آخرُ الحزنِ
فلا تیأسن. فاللہ مَلَّکَ یوسفًا ۔۔۔ خزائنه بعد الخلاصِ من السِّجنِ

اور کسی نے یہ شعر پڑھا ہے:

إذا الحادثاتُ بَلَغْنَ النُّهی ۔۔۔ وَکادتْ تَذوبُ لَهُنَّ المُهَجْ
وحلَّ البلاءُ وقلَّ العَزَاءُ ۔۔۔ فعند التَّنَا هِی یکونُ الفَرَجْ

اور اس معنی میں بہت زیادہ اشعار ہیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸

''اور ایک روز آنکلے برادران یوسف (علیہ السلام) اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکے''۔

قولہ تعالیٰ: وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ یعنی جب انہیں قحط لاحق ہوا تو وہ مصر آئے تاکہ غلہ حاصل کریں۔ یہ قرآن کریم کا

معجزانہ انحصار ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو کنعان میں بھی قحط آ گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بھیجا، جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ ان کی نرمی، مہربانی، حسن سلوک، عدل اور سیرت کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل چکا تھا۔ جب لوگوں پر مصیبت آئی تو حضرت یوسف علیہ السلام لوگوں کی خاطر سودے کے وقت خود موجود ہوتے اور ان کی تعداد کے مطابق انہیں کھانا دیتے۔ ہر آدمی کو ایک وسق (ساٹھ صاع) ملتا۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا **وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ** اور انہوں نے نہ پہچانا کیونکہ انہوں نے تو آپ کو بچپن میں چھوڑا تھا اور ان کا یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ غلامی کے بعد اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مدت بھی بڑی لمبی گزر چکی تھی۔

چالیس سال کی مدت گزری اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس لیے نہ پہچانا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کافر بادشاہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کو ریشمی لباس میں ملبوس دیکھا جبکہ آپ کی گردن میں سونے کا ہار تھا اور سر پر تاج اور آپ نے فرعون مصر کا سا لباس اور حلیہ بنا رکھا تھا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں اسی دور کے لباس اور حلیہ میں دیکھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس وجہ سے نہ پہچانا ہو کہ یہ ایک خلاف عقل اور خارق عادت معاملہ تھا اور اس سے مقصود امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''سو جب مہیا کر دیا ان کے لیے ان (کی رسد خوراک) کا سامان تو فرمایا: (دوبارہ آؤ) تو لے آنا میرے پاس اپنے پدری بھائی کو کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں۔ اور اگر تم اسے نہ لے آئے میرے پاس تو (سن لو) کوئی پیمانہ تمہارے لیے میرے پاس نہیں ہوگا اور نہ تم میرے قریب آسکو گے۔ وہ بولے ہم ضرور مطالبہ کریں گے اس کے بھیجنے کے متعلق اس کے باپ سے اور ہم ضرور ایسا کریں گے''۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ کہا جاتا ہے: جهزتُ القومَ تجهيزًا یعنی میں نے ان کو ان کے سفر کے لیے ان کا سامان دے دیا اور شادیوں کا جہیز وہی ہوتا ہے جس کی شوہر کو بطور ہدیہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض کوفیوں نے الجهاز جیم کے کسرہ کو بھی جائز قرار دیا ہے اس آیت کریمہ میں الجهاز سے مراد کھانے کا وہ سامان ہے جو انہیں آپ کے پاس سے ملا۔ سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس گیارہ اونٹ تھے جبکہ وہ خود دس تھے۔ انہوں نے حضرت یوسف کو کہا: ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے جو پیچھے رہ گیا ہے اور اس کا اونٹ ہمارے ساتھ ہے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں پیچھے رہ گیا؟ تو انہوں نے کہا: اس کے باپ کی اس کے ساتھ محبت کی وجہ سے۔ اور انہوں نے آپ کو بتایا کہ اس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جو

جنگل میں گیا اور ہلاک ہو گیا، آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے اس بھائی کو دیکھنا چاہتا ہوں جس کا تم نے ذکر کیا ہے تاکہ میں تمہاری صداقت اور اس کے ساتھ اس کے باپ کی محبت کا سبب جان سکوں۔ روایت ہے کہ وہ شمعون کو بطور رہن آپ کے پاس چھوڑ آئے اور پھر آپ کے بھائی بنیامین کو لے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام نے ترجمان کو کہا کہ انہیں کہو: تمہاری زبان ہماری زبان کے مخالف اور تمہارا لباس ہمارے لباس کے مخالف ہے تم کہیں جاسوس تو نہیں تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم جاسوس نہیں بلکہ ہم سب ایک باپ کے بیٹے ہیں اور وہ بوڑھا آدمی ہے، اس نے کہا: تمہاری تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم بارہ تھے ہمارا ایک بھائی جنگل کی طرف گیا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: دوسرا کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے باپ کے پاس؛ آپ نے فرمایا: کون تمہاری سچائی کو جانتا ہے؟ انہوں نے کہا: یہاں ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم نے آپ کو اپنے نسب کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے، تو اب آپ کو ہم پر کس طرح اطمینان ہو سکتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ (اپنے باپ سے اپنے بھائی کو میرے پاس لے آؤ) اگر تم سچے ہو، تو میں مطمئن ہو جاؤں گا أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ یعنی میں وزن پورا کرتا ہوں اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتا اور تمہارے بھائی کے لیے ایک اونٹ کا وزن زیادہ دے رہا ہوں فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي اگر تم اس کو میرے پاس لے کر نہ آئے تو پھر میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے ان کو دھمکی دی کہ اگر وہ اسے نہ لے کر آئے تو آپ انہیں غلہ نہیں بیچیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ کے دو احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے انہیں بھاؤ میں رخصت دی تو گویا وزن زیادہ ہو گیا اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے انہیں زیادہ وزن دیا ہو۔ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ آپ بہتر مہمان نواز ہیں، کیونکہ آپ نے ان کی عمدہ ضیافت فرمائی، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس تم آئے ہو ان میں میں امانت داری کے اعتبار سے بہتر ہوں۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ النزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''کھانا'' اور دوسری صورت میں المنزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھر ہے۔

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي یعنی میں اس کے بعد تمہیں کوئی چیز نہیں بیچوں گا کیوں کہ آپ نے انہیں اس حالت میں پورا وزن دے دیا۔ وَلَا تَقْرَبُونِ یعنی میں تمہیں اپنے ہاں قربت کا یہ مقام نہیں دوں گا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ آپ سے دور ہو جائیں گے اور واپس لوٹ کے نہیں آئیں گے کیونکہ آپ نے انہیں واپس لوٹنے پر ابھارا ہے۔ سدی نے کہا: آپ نے ان سے واپس لوٹنے تک رہن کا مطالبہ کیا، تو شمعون آپ کے پاس رہن کے طور پر رہا۔ کلبی نے کہا: آپ نے ان میں سے شمعون کو اس لیے منتخب فرمایا کہ کنویں کے واقعہ کے دن اس کی رائے اور گفتگو سب سے عمدہ تھی۔ اور تَقْرَبُونِ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے اسی وجہ سے اس میں سے نون اور یا کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ آیت کے آخر میں ہے۔ اگر یہ خبر ہوتی تو تَقْرَبُونِ نون کے فتح کے ساتھ ہوتا۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ یعنی ہم اس سے اس کا مطالبہ کریں گے اور یہ گذارش کریں گے وہ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں۔

وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ یعنی ہم اس کو یہاں تک لانے کے ضامن ہیں اور اس سلسلہ میں کوشش کریں گے۔

مسئلہ: اگر یہ کہا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کا مطالبہ کر کے اپنے باپ پر پریشانی ڈالنے کو کیسے جائز سمجھا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ اس کے چار جواب ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کرنے کے لیے آپ کو اس کا حکم دیا ہو تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت زیادہ ثواب عطا فرمایا جائے۔ اور آپ نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی ہو۔ 2۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے آگاہ کرنا مراد ہو۔ 3۔ اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ان کے دونوں بیٹے اکٹھے واپس جائیں گے تو ان کی خوشی دوگنی ہو جائے گی۔ 4۔ اپنے بھائی کے سامنے رشتے کے ظاہر ہونے سے پہلے ملاقات کے ذریعے محبت و خوشی پیش کرنا مقصود ہو۔

البتہ پہلا معنی اور توجیہہ زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور آپ نے فرمایا اپنے غلاموں کو کہ (چپکے سے) رکھ دو ان کا سامان (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا) ان خورجیوں میں تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب وہ واپس لوٹیں اپنے گھر والوں کے پاس شاید وہ لوٹ کر آئیں''۔

وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ یہ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات ہے اور یہی ابو حاتم، نحاس اور دیگر لوگوں کے نزدیک مختار ہے، جبکہ سب کوفیوں نے اسے لفتیانہ پڑھا ہے اور ابو عبید کے نزدیک مختار ہے۔ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے مصحف میں بھی اس طرح ہے، ثعلبی نے کہا: یہ دونوں عمدہ لغتیں ہیں۔ جس طرح کہ الصبیان اور الصبیہ۔ نحاس نے کہا: لِفِتْیٰنِهِ سواد اعظم کے مخالف ہے کیونکہ سواد اعظم کے نزدیک نہ اس میں الف ہے اور نہ نون لہٰذا اس منقطع سند کی بنیاد پر سواد اعظم کو نہیں چھوڑا جائے گا اور یہ وجہ بھی ہے کہ فتیة، فتیان کی نسبت زیادہ مناسب ہے کیونکہ فتیة عربوں کے نزدیک کم تعداد کے لیے بولا جاتا ہے اور تھوڑے لوگوں کا خورجیوں میں سامان رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور ان غلاموں نے ان کے سامان کو برابر کر دیا تھا اسی وجہ سے ان کے لیے اپنا سامان اپنی خورجیوں میں رکھنا ممکن ہوا تھا۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ غلام نہ ہوں بلکہ آزاد ہوں اور آپ کے معاونین ہوں۔ اور ان کا سامان وہ دراہم اور دینار تھے۔ حضرت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جوتے، وہ سامان جس کو بطور سالن استعمال کیا جاتا ہے اور زاد راہ تھا اور اسے رحل کہتے ہیں۔ ابن انباری نے کہا: برتن کو بھی رحل کہا جاتا ہے اور گھر کو بھی رحل کہتے ہیں اور لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ ہوسکتا ہے کہ راستے میں وہ محفوظ نہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے ایسا اس لیے کیا تاکہ جب وہ اسے پائیں تو واپس لوٹیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وہ بغیر قیمت کے کھانے کو قبول نہیں کریں گے۔ ایک قول کے مطابق یہ آپ نے اس لیے کیا تاکہ وہ کھانے کی خریداری کے لیے دوبارہ آپ کے پاس آئیں۔ ایک قول کے مطابق آپ نے ایسا اس لیے کیا کہ آپ نے اپنے باپ اور بھائیوں سے کھانے کی

قیمت لینے کو برا سمجھا۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا کرنے کی حکمت یہ تھی کہ وہ لوگ آپ کی فضیلت و مہربانی کو دیکھیں اور دوبارہ آپ کے پاس آنے کی طرف راغب ہوں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

”پھر جب واپس لوٹے اپنے باپ کے پاس تو عرض کرنے لگے: اے ہمارے پدر! (بزرگوار) روک دیا گیا ہم سے غلہ (از راہ نوازش) بھیجئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی (بنیامین) کو تاکہ ہم غلہ لا سکیں اور ہم یقیناً اس کی نگہبانی کریں گے۔ آپ نے (جواباً) فرمایا: کیا میں اعتماد کروں تم پر اس بارے میں بجز اس کے جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں اس سے قبل، پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ زیادہ مہربان ہے تمام مہربانی کرنے والوں سے۔ اور جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مال انہیں واپس لوٹا دیا گیا ہے (ترغیب دینے کے لیے) کہنے لگے: اے ہمارے پدر (محترم)! ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ (دیکھیے) ہمارا مال بھی لوٹا دیا گیا ہے ہماری طرف اور (اگر بنیامین ساتھ گیا تو) ہم رسد لائیں گے اپنے اہل خانہ کے لیے اور رکھوالی کریں گے اپنے بھائی کی اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ یہ غلہ بہت تھوڑا ہے“۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ انہوں نے یہ اس وجہ سے کہا کیونکہ انہیں فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ کہا گیا تھا۔ اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے ساتھ ہونے والے معاملے اور ملنے والی عزت و آرام سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ شمعون بطور رہن ان کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ وہ (یوسف) ان کی سچائی و صداقت کو جان نہیں لیتے۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ یعنی انہوں نے اس وقت کہا: ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے۔ نَكْتَلْ اصل میں نکتال تھا لام کلمہ سے ضمہ کو جزم کے لیے حذف کر دیا گیا۔ اور پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اہل حرمین، ابو عمرو اور عاصم کی قرات (نکتل) نون کے ساتھ ہے جبکہ سارے کوفیوں نے یکتل یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا ابو عبید کا مختار ہے تاکہ جو کچھ انہیں ملے اس میں وہ سب شریک ہو جائیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب یا کے ساتھ ہو تو اس وقت یہ صرف بھائی کے لیے ہوگا۔ نحاس نے کہا: یہ لازم نہیں؛ کیونکہ کلام دو صورتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں؛ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: فأرسِل أخانا یکتل معنا (ہمارے بھائی کو بھیجئے وہ ہمارے ساتھ وزن کرے گا؛) تو اس صورت میں یہ سب کے لیے ہوگا یا تقدیر کلام تقدیم و تاخیر کے بغیر ہوگا جبکہ کلام میں ان سب کے داخل ہونے پر دلیل ہوگی،

اس (توجیہ) پر حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِیۡ بِهٖ فَلَا كَيۡلَ لَكُمۡ عِنۡدِیۡ۔

وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ یعنی ہم اسے کسی تکلیف کے پہنچنے سے اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قَالَ هَلۡ اٰمَنُكُمۡ عَلَيۡهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنۡتُكُمۡ عَلٰۤى اَخِيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ یعنی تم نے یوسف کے ساتھ زیادتی کی تو اس کے بھائی کے حوالے سے میں تم پر کیسے اعتماد کرسکتا ہوں؟ فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا بیان کی بنیاد پر یہ منصوب ہے۔ یہ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات ہے۔ سارے کوفیوں نے اسے حال کی بنیاد پر حافظا پڑھا ہے۔ زجاج نے کہا: بیان کی بنیاد پر ہے اس آیت کریمہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے حوالے سے جواب ارشاد فرمایا؛ آیت کا معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ کا اس کی حفاظت کرنا تمہارے حفاظت کرنے سے بہتر ہے۔ کعب احبار نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت اور جلال کی قسم! تیرے میرے اوپر توکل کرنے کے بعد میں تیرے دونوں بیٹوں کو تیرے پاس واپس لوٹاؤں گا۔

وَ لَمَّا فَتَحُوۡا مَتَاعَهُمۡ آیت کریمہ میں کوئی بھی مشکل معنی نہیں یعنی واضح ہے۔ مَا نَبۡغِیۡ، مَا محل نصب میں استفہام کے مقام پر ہے؛ معنی یہ ہوگا: ہم اس کے علاوہ کس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اس نے ہمارے لیے وزن پورا کیا اور ثمن بھی ہمیں واپس لوٹا دیئے اس سے انہوں نے اپنے باپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ایک قول یہ ہے کہ مَا نافیہ ہے یعنی ہم آپ سے دراہم اور سامان نہیں چاہتے بلکہ ہمیں ہمارا ہی سامان کافی ہے جو ہماری طرف لوٹا دیا گیا۔ علقمہ سے روایت ہے ردت الینا را کے کسرہ کے ساتھ کیونکہ اصل میں "رددت" ہے جب دال کو دال میں مدغم کیا گیا تو دال کی حرکت کو را کی حرکت سے بدل دیا گیا۔ اور نَمِيۡرُ اَهۡلَنَا سے مراد ہے ہم ان کے لیے کھانا لائیں گے شاعر نے کہا:

بَعَثۡتُكَ مَائِرًا فَمَكَثۡتَ حَوۡلًا　　مَتٰى يَأۡتِىۡ غِيَاثُكَ مَنۡ تُغِيۡثُ(1)

میں نے تجھے کم عقلی کی حالت میں بھیجا تو پورا سال ٹھہر گیا، کب تیرا مددگار آئے گا جو مدد کرے گا۔

سلمی نے نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہم کھانا لانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وَ نَزۡدَادُ كَيۡلَ بَعِيۡرٍ ذٰلِكَ كَيۡلٌ يَّسِيۡرٌ یعنی بنیامین کے اونٹ کا بوجھ (زیادہ لائیں گے)۔

قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَهٗ مَعَكُمۡ حَتّٰى تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاۡتُنَّنِیۡ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡهُ مَوۡثِقَهُمۡ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ ۞

"آپ نے کہا: میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ یہاں تک کہ کرو تم میرے ساتھ وعدہ جو پختہ کیا گیا ہو اللہ کی قسم سے کہ تم ضرور لے آؤ گے میرے پاس اسے مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے پس جب وہ لے آئے آپ کے پاس اپنا پختہ وعدہ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تُؤْتُوْنِ کا مطلب ہے تعطونی۔ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی ایسا عہد جس پر یقین کیا جا سکے۔ سدی نے کہا: انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی کہ وہ ضرور اسے واپس لوٹائیں گے اور اسے کسی کے سپرد نہیں کریں گے لَتَاْتُنَّنِیْ میں ''لام'' لام قسم ہے۔ اِلَّآ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ مجاہد نے کہا: (اس کا مطلب ہے) مگر تم ہلاک ہو جاؤ یا مر جاؤ (1)۔ قتادہ نے کہا: مگر یہ کہ تم پر غلبہ پالیا جائے (2)۔ زجاج نے کہا: یہ محل نصب میں ہے۔ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ یعنی اس قسم کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے: عہد کی حفاظت کرنے والا، تدبیر و عدل کے ذریعے اسے قائم کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کریمہ کفالت بالعین اور وثیقہ بالنفس کے جواز میں اصل ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر علماء نے کہا ہے: یہ اس صورت میں جائز ہے جب متحمل بہ مال ہو۔ امام شافعی نے مال میں کفالت بالوجہ کو ضعیف قرار دیا ہے؛ اور ان کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے۔ عثمان بتی نے کہا: جب کسی نے قصاص یا زخم کی کفالت بالنفس کی تو اس کو نہ لانے کی صورت میں اس پر دیت اور زخم کا تاوان لازم ہوگا اور اسے ظلم کرنے والے کے مال میں سے ادا کیا جائے گا کیونکہ کفیل پر قصاص لازم نہیں ہوتا۔ یہ کفالت بالوجہ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ اور صحیح وہ تفریق ہے جو امام مالک نے کی کہ کفالت یا ضمانت مال میں ہو سکتی ہے اور حد اور تعزیر میں نہیں ہو سکتی جس طرح کہ اس کا بیان آئے گا۔

وَ قَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور آپ نے کہا: اے میرے بچو! (شہر میں) نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے بلکہ داخل ہونا مختلف دروازوں سے اور نہیں فائدہ پہنچا سکتا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی نہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کے لیے، اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب انہوں نے جانا چاہا تو آپ کو انہیں نظر بد لگنے کا اندیشہ لاحق ہوا؛ تو آپ نے انہیں شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونے کا حکم فرمایا۔ شہر کے چار دروازے تھے۔ آپ کو انہیں اس وجہ سے نظر بد کا اندیشہ ہوا کہ ایک آدمی کے گیارہ بیٹے ہو سکتے ہیں اور وہ سب خوبصورت، کمال کے حامل اور بھاری بھرکم تھے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اگر آیت کا معنی یہ ہو تو اس میں نظر سے بچنے پر دلیل ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ نظر حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک نظر آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر سکتی ہے''۔ اور اس سے بچنے کے حوالے سے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16　　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 18

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ (1) بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام مالک نے حضرت محمد بن ابی امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ابو سہل بن حنیف نے خرار (مدینہ کی وادی) سے غسل کیا، اپنا جبہ اتارا تو عامر بن ربیعہ دیکھ رہے تھے۔ راوی نے کہا: سہل سفید رنگت والا اور خوبصورت جلد والا تھا۔ تو عامر بن ربیعہ نے انہیں کہا: اتنے گورے رنگ کا اتنا خوبصورت شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار چڑھ گیا اور بخار شدت اختیار کر گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ سہل کو بخار چڑھ گیا ہے اور وہ آپ کے پاس نہیں جا سکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سہل کے پاس تشریف لائے تو حضرت سہل نے عامر کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں آپ کو بتایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی کیوں اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے؟ تم نے تبارک اللہ أحسن الخالقین اللھم بارک فیہ کیوں نہ کہا بے شک نظر کا لگنا حق ہے تم اس کے لیے وضو کرو'' (2)۔ حضرت عامر نے وضو کیا پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور وہ بالکل تندرست تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عامر کو کچھ اعضاء دھونے کا حکم دیا تو حضرت عامر نے اپنا چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے اور پاؤں کے اطراف اور ازار کے اندر جسم کا حصہ ایک برتن میں دھویا پھر اسے (غسالہ) کو حضرت سہل کے اوپر بہا دیا گیا تو حضرت سہل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور انہیں کوئی مسئلہ نہ رہا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ایک دن سوار ہوئے آپ کی طرف ایک عورت نے دیکھا تو کہا: تمہارا یہ امیر دونوں پہلوؤں میں پتلی اور نازک کمر والا ہے۔

آپ اپنے گھر واپس لوٹے تو گر پڑے آپ کو وہ بات بتائی گئی جو اس عورت نے کہی تو آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اس نے آپ کے لیے غسل کیا۔

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ نظر کا لگنا حق ہے اور یہ آدمی کو مار ڈالتی ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ علماء امت کا قول اور اہل سنت کا مذہب ہے، جبکہ بدعتیوں کے ایک گروہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ سنت، اس امت کے اجماع اور ایک امر واقع کے منکر ہیں، اس لیے کہ کتنے ہی لوگ ہیں جن کو نظر بد نے قبر میں داخل کر دیا ہے اور کتنے ہی خوبصورت اونٹ ہیں جن کو اس نے ہنڈیا میں پہنچا دیا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ: 102) (اور وہ اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے) اصمعی نے کہا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کی نظر لگتی تھی اس نے سنا کہ ایک گائے بہت زیادہ دودھ دیتی ہے اس کو یہ بہت اچھا لگا اس نے پوچھا: وہ کون سی گائے ہے؟ لوگوں نے کوئی اور گائے بتائی اور اس کو مخفی رکھا تو وہ دونوں گائیں مر گئیں۔ اصمعی نے کہا: میں نے اس آدمی کو کہتے ہوئے سنا: جب میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگتی ہے تو میں ایک حرارت پاتا ہوں جو میری آنکھوں سے نکلتی ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، ماعوذ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 260

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، العین، صفحہ 259۔ ایضاً، حدیث نمبر 3499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے کوئی چیز اچھی لگے تو وہ بارك الله فيه کہے کیونکہ جب وہ برکت کی دعا کرے گا تو لازمی طور پر برائی کو اس سے ہٹالیا جائے گا۔ کیا آپ حضرت عامر کو کہے جانے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو نہیں دیکھتے: اَلَّا برکت تو نے بارك الله فيه کیوں نہ کہا۔ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب نظر لگانے والا بارك الله فيه کہہ دیتا ہے تو نظر نہ لگتی ہے اور نہ ہی نقصان کرتی ہے، البتہ اگر وہ یہ الفاظ نہ کہے تو پھر نظر لگ جاتی ہے۔ پوری تبریک یہ ہے: تبارك الله أحسن الخالقين اللهم بارك فيه۔

مسئلہ نمبر 4۔ نظر لگانے والی کی نظر جب لگ جائے اور وہ بارك الله فيه نہ کہے تو اسے غسل کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ انکار کرے تو اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے، بالخصوص یہ امر، کیونکہ بعض اوقات نظر لگنے والے کی ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے اور کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کو ایسے کام سے روکے جس کی وجہ سے اس کے ایک بھائی کو فائدہ ہو سکتا ہے اور وہ نقصان سے بچ سکتا ہے بالخصوص اس صورت میں کہ جب وہ نقصان اس کی وجہ سے ہو رہا ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ جس آدمی کو اپنی آنکھ لگنے کا پتہ چل جائے اسے لوگوں میں جانے سے روک دیا جائے گا تاکہ لوگ اس کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: امام اسے گھر میں نظر بند کرنے کا حکم دے گا اور اگر اس کے رزق کا مسئلہ ہو تو اس کی کفالت کرے گا اور لوگوں سے اس کی اذیت کو روکا جائے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے ملک بدر کیا جائے گا؛ البتہ امام مالک کی وہ روایت جو ہم نے ذکر کی ہے وہ ان اقوال کی تردید کرتی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو حضرت عامر کی قید کا حکم دیا اور نہ ہی ملک بدری کا، بلکہ بعض اوقات نیک آدمی کی بھی نظر لگ جاتی ہے اور نہ تو اس میں یہ بات قدح کا باعث ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس پر فسق کا حکم لگایا جا سکتا ہے؛ اور جس آدمی نے کہا ہے: اسے قید کیا جائے اور نظر بندی کا حکم دیا جائے گا تو یہ احتیاط ہے اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے ہے۔ والله اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک نے حمید بن قیس مکی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جعفر بن ابی طالب کے دو بیٹے لائے گئے تو آپ نے ان کی دائی کو فرمایا: ''کیا بات ہے میں ان دونوں کو کمزور دیکھتا ہوں؟'' تو دائی نے کہا: یا رسول الله! ان دونوں کو جلدی نظر لگ جاتی ہے، اور آپ نے ہمیں ان کو دم کرنے سے نہ روکا البتہ ہم نہیں جانتے کہ آیا وہ تمہارے موافق آتا ہے یا نہیں؟ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کو دم کرو کیونکہ اگر تقدیر سبقت لے گئی تو نظر سبقت لے جائے گی۔'' یہ حدیث منقطع ہے۔ البتہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی والی روایت محفوظ ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ اس میں ہے کہ دم ان چیزوں میں سے ہے جن کے ذریعے مصیبت کو روکا جاتا ہے اور نظر انسان میں اثر بھی کرتی ہے اور تکلیف بھی دیتی ہے یعنی اسے کمزور کرتی ہے اور اس میں نقاہت پیدا کرتی ہے؛ اور یہ الله تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے ہے اور کہا جاتا ہے کہ نظر بڑوں کی نسبت چھوٹوں میں جلدی اثر کرتی ہے۔ والله اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ حدیث ابو امامہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگانے والے کو اس آدمی کے لیے غسل کرنے کا حکم فرمایا

ہے جس کو نظر لگی ہے اور اس روایت میں دم کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔" ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: دم اس صورت میں ہوگا جب نظر لگانے والے کا پتہ نہ ہو، اور جب نظر لگانے والے کا پتہ چل جائے تو پھر حدیث ابوامامہ کے مطابق اسے وضو کا حکم دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ یعنی ایسی چیز سے جس سے میں تمہیں محتاط رہنے کا حکم دیتا ہوں یعنی احتیاط، تقدیر کے ساتھ کوئی نفع نہیں دیتی۔ **اِنِ الْحُكْمُ** یعنی امر اور قضاء **اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ** یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا۔ **وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ** اور اسی پر توکل کرنے والوں کو توکل کرنا چاہیے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾

"اور جب وہ (مصر میں) داخل ہوئے جس طرح حکم دیا تھا انہیں ان کے باپ نے، وہ نہیں فائدہ پہنچا سکتا تھا انہیں اللہ کی تقدیر سے کچھ بھی مگر (یہ احتیاطی تدبیر) ایک خیال تھا نفس یعقوب میں جسے انہوں نے پورا کیا اور بے شک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ اور جب پہنچے یوسف کے پاس تو یوسف نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو (نیز) اسے فرمایا: میں تمہارا بھائی ہوں نہ غمزدہ ہو (ان حرکتوں پر) جو یہ کیا کرتے تھے پھر جب فراہم کر دیا انہیں ان کا سامان (خوراک) تو رکھ دیا (اپنا) پیالہ اپنے بھائی کی خورجی میں پھر پکارا ایک پکارنے والا: اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو"۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ یعنی مختلف دروازوں سے **مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ** یعنی اگر وہ ان پر کوئی ناپسندیدہ بات واقع کرنے کا ارادہ فرمالے تو اللہ کی تقدیر سے انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ **اِلَّا حَاجَةً** یہ استثنا ہے مگر متصل نہیں **فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا** یعنی خدشہ تھا جو ان کے دل میں کھٹکا: اور وہ ان کی وصیت تھی کہ وہ جدا جدا رہیں۔ مجاہد نے کہا: نظر کا اندیشہ تھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ ہے: (متفرق داخل ہونے کی بنیاد اس خدشے پر تھی) کہ بادشاہ ان کی تعداد اور قوت کو نہ دیکھ لے کہ کہیں حسد کے مارے یا احتیاطاً ان کو پکڑ ہی نہ لے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ نحاس نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس نے کہا: یہاں نظر کا کوئی مطلب نہیں ہے اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اندیشے اور خوف والے کام سے محتاط کرے اور اس کی رہنمائی ایسے عمل کی طرف کرے جس میں سلامتی اور نجات ہو کیونکہ دین خیر خواہی ہے اور مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنَّهٗ یعنی یعقوب علیہ السلام لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ یعنی اپنے دین کے معاملے کے بارے میں۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اپنے دین کے معاملے میں جو کچھ حضرت یعقوب علیہ السلام جانتے تھے وہ وہ نہیں جانتے تھے۔ ایک قول کے مطابق لَذُوْ عِلْمٍ سے مراد عمل والا ہے؛ کیونکہ علم، عمل کا پہلا سبب ہے لہٰذا یہاں سبب بول کر مسبب مراد لے لیا گیا ہے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ (1) قتادہ نے کہا: اٰوٰۤى اِلَیْهِ سے مراد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو اپنے پاس بٹھایا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے حکم دیا کہ دو دو آدمی ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ، تو ایک بھائی اکیلا رہ گیا سو اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور فرمایا: میں نے تنہائی کی وجہ سے اس پر شفقت کی ہے اور دیگر بھائیوں سے علیحدہ راز میں اس بھائی کو فرمایا: اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ یعنی میں تمہارا بھائی ہوں تو پریشان نہ ہو بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ان کی ان حرکتوں پر جو یہ کیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ جب بنیامین نے جان لیا کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں تو اس نے آپ کو کہا: مجھے ان کے حوالے نہ کرنا، تو آپ نے فرمایا: تو میرے بارے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے غم کو جانتا ہے تو اس طرح تو ان کے غم میں اضافہ ہو جائے گا تو بنیامین نے نکلنے سے انکار کر دیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تمہیں بغیر کسی نامناسب عمل کے قید کرنا ممکن نہیں، بنیامین نے کہا: مجھے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے صاع کو ان کے سامان میں ڈال دیا؛ یا تو خود ڈالا کہ کسی کو بھی اس کا پتہ نہ چلا یا پھر اپنے کسی خاص آدمی کو یہ کام کرنے کا حکم دیا۔ اور التجھیز سے مراد کھولنا اور کام کو فوراً کرنا ہے، اسی سے جھز علی الجریح ہے یعنی اس کو اس نے قتل کر دیا اور اس کا معاملہ جلدی جلدی ختم کر دیا۔ السِّقَایَةَ اور صاع ایک ہی چیز ہیں یہ ایک ایسا برتن ہے جس کے دو سرے ہوتے ہیں اور درمیان میں ایک پکڑنے والا قبضہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اس کے ایک سرے سے پیتا تھا اور دوسرے سرے سے کھانے کو لیتا تھا؛ یہ نقاش کا قول ہے جو اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے پیا جائے تو وہ صواع ہے۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الْخَمْرَ بِالصُّوَاعِ جِهَارًا

ہم صواع کے ذریعے اعلانیہ شراب پیتے ہیں۔

اس کی جنس میں اختلاف ہے؛ شعبہ نے ابو بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بادشاہ کا صواع چاندی کی ایسی چیز تھی جو مکوک کے مشابہ تھی ایسی چاندی سے بنا ہوا تھا جو جواہرات سے مرصع تھا اس کو سر پر رکھا جاتا تھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی زمانہ جاہلیت میں ایک صاع تھا۔ نافع بن ازرق نے آپ سے پوچھا: صواع کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: برتن؛ اس کے بارے میں اعشیٰ نے کہا ہے:

له دَرْمَكٌ فی رأسه و مَشَارِبٌ وقِدْرٌ وطَبَّاخٌ وصاعٌ ودَیسَقُ

عکرمہ نے کہا: یہ چاندی کا تھا (2)۔ عبدالرحمن بن زید نے کہا: سونے کا تھا؛ اسی کے ذریعے آپ نے ان کے کھانے کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 21
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 24

تو لا مقصود ان کی عزت و احترام میں مبالغہ تھا۔ ایک قول کے مطابق اس کے ذریعے اس وجہ سے کیل کیا جاتا تھا کہ کھانا کم تھا۔ اور صاع مذکر اور مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔ جس نے اس کو مونث کہا اس نے اصوع بروزن '' اَدور'' کہا ہے اور جس نے مذکر استعمال کیا ہے اس نے اصواع بروزن اثواب کہا ہے۔

اس کی کئی قرآتیں ہیں: صواع عام قرآت ہے؛ صوغ غین کے ساتھ یہ یحییٰ بن یعمر کی قرآت ہے؛ انہوں نے کہا: یہ ایک ایسا برتن تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ صوع عین کے ساتھ یہ ابورجاء کی قرأت ہے صوع صاء مضموم، واو ساکنہ اور عین کے ساتھ حضرت ابی کی قرأت ہے۔ صاع صاد اور عین کے درمیان الف کے ساتھ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی قرآت ہے۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ یعنی منادی کرنے والے نے منادی کی اور اعلان کیا۔ اَذَّنَ تکثیر کے لیے ہے گویا کہ ندا دینے والے نے بار بار منادی کی اَیَّتُهَا الْعِیْرُ، الْعِیْرُ سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوجھ لادا جاتا ہے جیسے گدھا، اونٹ اور خچر وغیرہ۔ مجاہد نے کہا: ان کی سواریاں گدھے تھے (1)۔ ابوعبید نے کہا: الْعِیْرُ سے مراد وہ اونٹ ہے جو سفر کرتا ہے اور اس پر سواری کی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا یا اصحاب العیر جس طرح اللہ کا ارشاد وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) یعنی واسأل اهل القرية ہے۔ اور یا خیل الله ارکبی یعنی یا اصحاب خیل الله ہے۔ یہاں دو اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر کہا جائے بنیامین اپنی خوشی سے وہاں بیٹھنے پر کس طرح راضی ہوئے حالانکہ اس میں غم کی زیادتی کے ساتھ باپ کی نافرمانی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ان کی موافقت کر لی؟ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کیسے کر لی حالانکہ وہ بری تھے یہ دوسرا اعتراض ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام پر پریشانی و غم اتنا غالب آچکا تھا کہ بنیامین کی گمشدگی نے اس میں کوئی اثر نہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب بنیامین گم ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ (یوسف: 84) اور بنیامین کی طرف آپ نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور شاید حضرت یوسف علیہ السلام نے وحی کی وجہ سے ان کے ساتھ اتفاق کر لیا ہو۔ اس صورت میں کوئی اعتراض ہی نہیں۔ اور جہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کرنے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود انہیں ان کے باپ سے چوری کیا اور کنویں میں پھینک دیا تھا پھر بیچ دیا تھا، لہٰذا وہ اس عمل کی وجہ سے اس نام کے مستحق تھے سو اس نام کا اطلاق ان پر صادق آتا تھا۔ جبکہ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس سے یہ مراد لیا تھا کہ اے قافلہ والو! تمہاری حالت چوروں کی سی ہے؛ اور مطلب یہ ہوگا کہ کسی اور آدمی کی چیز بادشاہ کی رضامندی اور علم کے بغیر تمہارے پاس ہے۔ اس کا ایک اور جواب یہ بھی ہے کہ یہ اپنے بھائی کو ساتھ رکھنے اور ان سے جدا کرنے کا ایک حیلہ تھا، یہ جواب اس صورت میں ہوگا جب بنیامین کو ان کی خورجی میں صاع کے رکھے جانے کا علم نہ ہو اور نہ ہی آپ نے خود ان کو اس بات کی خبر دی ہو۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کلام کا معنی استفہام ہے، یعنی کیا تم چور ہو؟ جس طرح کہ وتلك نعمة یعنی أو تلك نعمة تمنها علی؟ اور مقصود یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 25

طرف جھوٹ کی نسبت نہ کی جائے۔

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

''(حیرت زدہ ہوکر) بولے درانحالیکہ وہ ان کی طرف متوجہ تھے کون سی چیز تم نے گم کی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے گم کیا ہے بادشاہ کا پیالہ اور وہ شخص جو (ڈھونڈ) لائے گا اسے (بطور انعام) بار شتر (غلہ) دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں بَعِيْرٍ سے مراد اونٹ ہے۔ جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ گدھا ہے یہ بعض عربوں کی لغت ہے یہ مجاہد کا قول ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے اور مجاہد نے کہا: زَعِيْمٌ سے مراد وہ منادی کرنے والا ہے جس نے أيتها العير کہا تھا(1)۔ زعیم، کفیل، حمیل، ضمین اور قبیل برابر ہیں اور زعیم سے مراد رئیس ہے۔

شاعر نے کہا:

وانِّي زَعِيمٌ إنْ رَجعتُ مُمَلَّكا بِسَيْرٍ تَرى مِنهُ الفُرَانِقُ أَزْوَرَا

أی زعیم یعنی میں رئیس ہوں۔

لیلی اخیلیہ نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

ومُخَرَّقٍ عنهُ القميصُ تَخَالُهُ يومَ اللِّقاءِ من الحياءِ سَقِيمًا

حتىٰ إذا رَفَعَ اللّوَاءَ رأيتَهُ تحتَ اللِّواءِ على الخَميسِ زَعِيمًا(2)

مسئلہ نمبر 2۔ اگر کہا جائے: آپ نے اونٹ کے بوجھ کی ضمانت کیسے قبول کر لی حالانکہ وہ مجہول ہے اور مجہول کی ضمانت صحیح نہیں؟ تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ اونٹ کا بوجھ ان کے نزدیک معین و معلوم تھا جس طرح کہ وسق؛ لہٰذا اس کی ضمانت صحیح ہے البتہ یہ چور کے مال کا بدلہ تھا اور چور کے لیے ایسا صحیح نہیں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید یہ ان کی شریعت میں صحیح ہو یا پھر یہ جعل (کسی چیز کو ڈھونڈنے کی اجرت) ہو۔ اور اس آدمی کے لیے مال خرچ کرنے کے مترادف ہو جو تفتیش کرتا ہے اور ڈھونڈتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: ایک جُعل کے جواز کی اس کو ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے اس میں جہالت جائز ہے جو کہ کسی اور عقد میں جائز نہیں؛ جب آدمی نے کہا: جس نے ایسا کیا تو اس کے لیے یہ ہوگا تو یہ صحیح ہے۔ جُعل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک طرف معلوم ہوتی ہے جبکہ دوسری ضرورت کی بنا پر مجہول ہوتی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 26
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 28

ہے بخلاف اجارہ کے؛ اس میں عوض اور معوض دونوں جہتوں سے مقرر ہوتا ہے؛ یہ ان عقود جائزہ میں سے ہے جن کو کسی ایک کے لیے فسخ کرنا جائز ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مجعول لہ کے لیے اس کو شروع سے پہلے اور بعد میں دونوں صورتوں میں فسخ جائز ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے حق کو ساقط کرنے پر راضی ہو جبکہ جاعل کے لیے اسے اس وقت فسخ کرنا جائز نہیں ہوتا جب مجعول لہ کام میں شروع ہو جائے۔ عقد جعل میں متعاقدین کا حاضر ہونا شرط نہیں ہوتا جس طرح کہ دیگر عقود میں شرط ہوتا ہے؛ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ یہ سب امام شافعی نے فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر4۔ جب آدمی نے کہا: جو میرے بھاگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے اتنے دینار، تو جب کوئی آدمی اسے لے آیا تو اسے وہ رقم لازم ہو جائے گی اور اگر بغیر ضمان کے لے کر آیا تب بھی مال لازم ہو گا جب وہ اجرت کے مطالبے پر اسے لے کر آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جاء بابق فله اربعون درهما جو بھگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے چالیس درہم ہوں گے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات میں کوئی تفریق بیان نہیں فرمائی کہ وہ عقد ضمان کی صورت میں لایا یا بغیر عقد کے لایا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اور اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا: جس نے کسی آدمی کا کوئی ایسا کام کیا جس کا کرنا اس پر اس کے مصالح میں سے بذات خود لازم تھا تو اس کے لیے یہ مال لازم ہو گا، اور اگر وہ ایسا آدمی ہے اور اجرت پر کام کرتا ہے تو اس کے لیے اجرت مثل ہو گی۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس سبب میں ہم نے امام شافعی کی مخالفت کی ہے۔

مسئلہ نمبر5۔ دوسری دلیل۔ کفالت کا جواز آدمی پر ہو گا؛ کیونکہ ضامن منادی حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ تھا، ہمارے علماء نے کہا: جب آدمی نے کہا تحملت، تکفلت، ضمنت، أناحميل، أنازعيم، أنا كفيل، أنا ضامن، أنا قبيل، هولك عندي، هولك علي، هولك إلي یا هولك قبلي تو یہ ساری کفالت ہے اور اسے لازم ہو گی۔ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی تو کیا اسے مال کی ضمانت لازم ہو گی یا نہیں؟ کوفیوں نے کہا: جس نے کسی آدمی کی کفالت بالنفس کی تو اسے وہ حق لازم نہیں ہو گا جو مطلوب پر تھا اگر مطلوب فوت ہو جائے۔ یہی امام شافعی کے دو مشہور قولوں میں سے ایک ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: جب کسی نے کفالت بالنفس کی اس حال میں کہ اس پر مال لازم تھا تو اگر وہ اسے لے کر نہ آیا تو بطور تاوان اس پر مال لازم ہو گا اور پھر مطلوب پر رجوع کرے گا؛ اور اگر اس نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی اور کہا: میں مال کا ضامن نہیں ہوں گا تو اس پر مال میں سے کچھ نہیں ہو گا۔ اور جس نے بطور تاوان مال کو لازم قرار دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کفیل کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کفیل بالوجہ سے خون کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے؛ پس جب وہ اس کا ضامن بنا اور پھر اسے نہ لایا تو گویا وہ اس پر غالب آگیا اور اس کے ہاتھوں سے نکل گیا لہٰذا اسے مال لازم ہو جائے گا۔ امام طحاوی نے احناف کی دلیل کو بیان کرتے ہوئے کہا: مکفول بہ کی موت کی وجہ سے مال کی ضمانت کے کوئی معنی نہیں کیونکہ اس نے کفالت بالنفس کو قبول کیا تھا نہ کہ کفالت بالمال کو، اور یہ تو محال ہے کہ جس کی اس نے ضمانت دی ہی نہیں وہ اسے لازم ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے کی طرف سے مال کا کفیل بنا؛ تو کیا مطالبہ کرنے والے کے لیے ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام ثوری، احناف، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد اور اسحق نے کہا: وہ جس سے چاہے لے سکتا ہے یہاں تک کہ اپنا حق پورا کر لے؛ اور یہی امام مالک کا قول تھا پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا اور کہا: وہ کفیل سے نہیں لے سکتا البتہ اگر مقروض کی مفلسی کا اعلان کر دیا جائے یا وہ غیب ہو جائے تو پھر کفیل سے مطالبہ جائز ہوگا؟ کیونکہ جس پر حق لازم ہے اسی سے لینا زیادہ بہتر ہے، ہاں اگر وہ نہ رہے تو پھر کفیل سے لیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں تو وہ اس سے لینے میں معذور ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ اور قیاس یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کر سکے۔ ابن ابی لیلی نے کہا: جب آدمی کسی کے لیے مال کا ضامن بنا تو وہ مال کفیل پر لازم ہو جائے گا اور اصل اس سے بری ہو جائے گا، البتہ اگر مکفول لہ نے ان دونوں سے مطالبہ کرنے کی شرط لگا لی ہو تو پھر ان دونوں میں سے جس سے چاہے لے سکتا ہے، انہوں نے حضرت ابو قتادہ (1) کی ضمانت کی وجہ سے میت کے بری ہو جانے والے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ یہی ابو ثور کا بھی قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ضمانت صرف ان حقوق میں دی جا سکتی ہے جن کی نیابت ہو سکتی ہے جن کا تعلق اموال کے ساتھ ہو اور وہ پختہ طریقہ سے ثابت بھی ہو؛ کفالت بالکتابت صحیح نہیں کیونکہ یہ ثابت و مستقر دین نہیں؛ کیونکہ غلام اگر بدل کتابت دینے سے عاجز آ جائے تو وہ پھر غلام بن جاتا ہے اور اس کی کتابت فسخ ہو جاتی ہے۔ اور جہاں تک ان حقوق کا تعلق ہے جو کوئی آدمی کسی کی طرف سے ادا نہیں کر سکتا تو ان میں کفالت و ضمانت بھی نہیں ہوگی اور مدعی اسے قید کرے گا جس پر حد لازم ہے یہاں تک کہ اس کے معاملے کو وہ دیکھے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے حدود و قصاص میں کفالت کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: جب مقذوف یا مدعی قصاص نے کہا کہ میرے پاس بینہ حاضر ہے تو وہ تین دن کی ضمانت لے گا؛ امام طحاوی نے ان کے حق میں حمزہ بن عمرو عن عمرو بن مسعود و جریر بن عبداللہ و اشعث کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے صحابہ کی موجودگی میں کفالت بالنفس کا فیصلہ کیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ۝۷۳ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۷۴ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۵

"کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو کہ ہم (یہاں) اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں زمین میں اور نہ ہی ہم چوری پیشہ ہیں (خدام یوسف) نے کہا: پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ اس کی سزا

1۔ سلمہ بن اکوع نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جنازہ کے لیے تشریف لائے آپ نے فرمایا: "کیا اس پر کوئی قرض ہے" لوگوں نے کہا: "ہاں" آپ نے فرمایا: "کیا اس نے کوئی چیز چھوڑی ہے"، انہوں نے کہا: "نہیں" آپ نے فرمایا: "اپنے دوست کا جنازہ پڑھ لو" حضرت ابو قتادہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ جنازہ پڑھیے اس کا قرض میرے ذمے رہا" تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

یہ ہے کہ جس کے سامان میں یہ پیالہ دستیاب ہو تو وہ خود ہی اس کا بدلہ ہے، اسی طرح ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ روایت ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی کھیتی کا نقصان کرتے تھے انہوں نے اپنے اونٹوں کے مونہوں کو باندھا ہوا تھا تاکہ وہ لوگوں کی کھیتیوں کو خراب نہ کریں۔ بعض نے کہا: وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ روایت ہے کہ انہوں نے وہ سامان واپس لوٹا دیا جو ان کی خورجیوں میں تھا؛ تو اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ جو آدمی حاصل شدہ مال واپس لوٹا دے وہ چور کیسے ہو سکتا ہے؟

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ معنی یہ ہوگا: اگر تمہارا جھوٹ ظاہر ہو جائے تو پھر ایسا کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جواب دیا: جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ یعنی اسے غلام بنا لیا جائے گا۔ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ مبتدا ہے اور مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ اس کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: جزاءه استعباد من وجد في رحله یہ غلام بنانے سے کنایہ ہے جس طرح کہا جاتا ہے: جزاء من سرق القطع فهذا جزاءه جس نے چوری کی اس کی سزا قطع ید ہے پس یہی اس کی سزا ہے تو جملہ میں تاکید کا معنی پایا جا رہا ہے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی ہم اس طرح ظالموں کے ساتھ کرتے ہیں یعنی جب وہ چوری کریں تو انہیں غلام بنا لیتے ہیں، تو یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین میں تھا اور ان کا یہ قول ان میں سے اس کا ہے جس کو چوری کے حوالے سے کوئی شک و شبہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے اس کی غلامی کو ثابت کیا جس کی خورجی میں سے پیالہ ملے، اور اہل مصر کے ہاں چور کا حکم یہ تھا کہ جس سے مال مل جائے اس سے دوگنا مال وصول کیا جاتا؛ یہ حضرت حسن اور سدی وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ۔ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ چوری کی وجہ سے قطع ید کا ہونا پہلی سب شریعتوں کا ناسخ ہے اسی طرح جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کو غلام بنانے کا قانون تھا یہ اس کا بھی ناسخ ہے۔ واللہ اعلم۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝

"پس تلاشی لینی شروع کی ان کے سامانوں کی یوسف کے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے آخر کار نکال لیا وہ پیالہ اس کے بھائی کی خورجی سے، یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لیے، نہیں رکھ سکتے تھے یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ مصر کے قانون میں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، ہم بلند کرتے ہیں درجے جن کے چاہتے ہیں، اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی خورجیوں سے شروع کیا کیونکہ اگر اپنے بھائی کی خورجی سے شروع کرتے تو ان کے دلوں میں الزام اور شک پیدا ہو سکتا تھا تو گویا اس طرح الزام اور شک کی نفی کر

دی۔ الوعاء واو کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں؛ اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں سامان کی حفاظت کی جاتی ہے اور اسے بچایا جاتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ یعنی بنیامین کی خورجی سے نکالا؛ استخرج کے ساتھ آنے والی ھا ضمیر سے مراد سقایۃ ہے یا پھر صواع ہے یہ اس آدمی کے نزدیک ہوگا جو اسے مؤنث سمجھتا ہے؛ اور وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ فرمایا یہ ضمیر مذکر کی ہے تو یہ اس کے نزدیک ہے جو اس کو مذکر سمجھتا ہے۔

جب آپ کے بھائیوں نے یہ صورتحال دیکھی تو اپنے سر جھکا لیے اور مختلف سوچیں سوچنے لگے، بنیامین کے پاس آئے اور کہا: اے بنیامین! تیری بربادی ہو! ہمیں آج کے دن کی طرح کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی، تیری ماں راحیل نے دو بیٹے جنے اور وہ دونوں چوری کے لیے، انہوں نے اپنے بھائیوں کو کہا: اللہ کی قسم! میں نے اسے چوری نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے پتہ ہے کہ کس نے میرے سامان میں اسے رکھا؟ روایت ہے کہ انہوں نے بنیامین کو کہا: اے بنیامین! کیا تو نے چوری کی ہے؟ بنیامین نے کہا: اللہ کی قسم! نہیں؛ انہوں نے کہا: کس نے تیری خورجی میں پیالہ رکھا؟ بنیامین نے کہا: جس نے تمہاری خورجیوں میں سامان رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ چیک کرنے والا جب آدمی کی خورجی سے فارغ ہوا تو اس نے اپنے اس فعل پر توبہ کرتے ہوئے استغفار کیا؛ حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ استغفار کرنے والے حضرت یوسف علیہ السلام تھے؛ کیونکہ وہی انہیں چیک کرنے والے تھے اور جانتے تھے کہ پیالہ کہاں ہے یہاں تک کہ بنیامین کی خورجی کی چیکنگ پر انہوں نے اختتام کیا اور کہا: میرا نہیں خیال کہ یہ نوجوان اس بات پر راضی ہو اور نہ ہی اس نے کوئی چیز لی ہے، تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: اللہ کی قسم! ہم تب تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک آپ اس کو چیک نہیں کریں گے؛ یہ بات آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اطمینان قلب کا باعث ہوگی؛ آپ نے اس کی تلاشی لی اور پیالہ نکال لیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے لی جانے والی یہ تلاشی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ منادی نے یہ کاروائی آپ کی رائے اور مشاورت سے کی؛ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ بھی اس کو تقویت دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اس میں تین مسائل ہیں؛

مسئلہ نمبر 1۔ كِدْنَا کا معنی ہے صنعنا ہم نے کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا بمعنی دبرنا یعنی ہم نے تدبیر کی منقول ہے۔ ابن الانباری نے کہا: أردنا یعنی ہم نے ارادہ کیا۔ شاعر نے کہا:

كَادَتْ وَ كِدْتُ وَ تِلْكَ خَيْرُ إِرَادَةٍ ... لَوْ عَادَ مِنْ عَهْدِ الصِّبَا مَا قَدْ مَضَى

اس نے ارادہ کیا اور میں نے ارادہ کیا اور یہ اچھا ارادہ ہے کہ اگر وہ بچپن کے عہد سے واپس لوٹ آئے جو کہ گزر چکا ہے۔

اور اس واقعہ سے مقاصد کو حیلہ کے ذریعے حاصل کرنے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، بشرطیکہ وہ حیلہ شریعت کے مخالف نہ ہو اور نہ ہی شریعت کے کسی قانون کو ختم کرنے والا ہو، بخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کہ انہوں نے حیلہ کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور علت کو ختم ہی کیوں نہ (1) کر دے۔

1۔ امام قرطبی نے امام اعظم پر جو اعتراض کیا ہے اس کے علماء احناف نے بڑے مسکت جوابات دیے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سال پورا ہونے سے پہلے آدمی اپنے مال میں بیع وہبہ کے ذریعے تصرف کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی نیت زکوٰۃ سے فرار کی نہ ہو۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جب سال پورا ہو جائے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت ہو جائے تو پھر اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کرنا یا مال میں کمی کرنا جائز نہیں اس طرح نہ اکٹھے مال میں تفریق کرنا اور نہ ہی متفرق مال کو جمع کرنا درست ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جب آدمی نے سال پورا ہونے سے ایک ماہ یا اس کے لگ بھگ کے عرصہ سے پہلے زکوٰۃ سے فرار کی نیت سے اپنے مال میں کمی کی تو بھی سال مکمل ہونے پر اسے زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد خشية الصدقة(1) سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی اس نے مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار اختیار کرتے ہوئے تفریق کی تو یہ بات اس کے لیے نقصان دہ نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا لزوم صرف سال کی تکمیل کی صورت میں ہوتا ہے اور سال کی تکمیل سے پہلے خشية الصدقة کے ارشاد کا اطلاق اس پر ہوتا ہی نہیں۔

ابن عربی نے کہا: میں نے ابوبکر محمد بن ولید فہری وغیرہ کو کہتے ہوئے سنا ہے: ہمارے شیخ قاضی القضاۃ ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی دس ہزار دینار کے مالک تھے۔ جب سال کا اختتام آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور انہیں کہا: میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میری طاقت کمزور ہو گئی ہے، جبکہ یہ مال ہے جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں لہٰذا یہ تمہارا ہے۔ پھر انہوں نے مال دے دیا لوگ اٹھا کر ان کے بیٹوں کے گھر لے گئے، پھر جب سال کا اختتام آیا تو انہوں نے کسی کام کے لیے اپنے بیٹوں کو بلایا۔ بیٹوں نے کہا: اے ہمارے باپ! ہمیں آپ کی زندگی کی امید ہے اور جب تک آپ زندہ ہیں ہمیں مال میں کوئی رغبت نہیں، کیونکہ آپ اور آپ کا مال ہمارا ہی ہے۔ سو یہ مال لے لیجئے۔ لوگوں نے مال اٹھایا اور ان کے ساتھ رکھ دیا اور مال کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق انہوں نے اکٹھے مال کو متفرق اور متفرق کو پھر جمع کرکے اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کیا ہے اور یہ بہت بڑی بحث ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ایک مربوط کتاب لکھی ہے جس کا نام انہوں نے "کتاب الحیل" رکھا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس میں پھر کئی باب بنائے ہیں جن میں ایک باب باب الزکوۃ وألا یفرق بین مجتمع ولا یجمع بین متفرق خشية الصدقه کے عنوان سے ہے۔ اس میں حضرت انس بن مالک والی حدیث بھی انہوں نے بیان کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف زکوٰۃ کے فریضہ کے بارے میں لکھا اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ والی حدیث بھی بیان کی کہ ایک اعرابی جس کے بال پراگندہ تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ الحدیث، اور اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں افلح إن صدق (2) یا یہ الفاظ ہیں دخل الجنة إن صدق اور بعض لوگوں (امام ابوحنیفہ) نے کہا ایک سو بیس اونٹوں میں دو حصے زکوٰۃ ہے۔ اگر مالک نے جان بوجھ کر ان کو ہلاک کر دیا یا انہیں ہبہ کر دیا یا اس نے زکوٰۃ سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب لایجمع بین متفرق و یتفرق بین مجتمع، جلد 1، صفحہ 195

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، وجوب صوم رمضان، جلد 1، صفحہ 254

بچنے کا کوئی حیلہ کیا تو اس پر کچھ بھی لازم نہ ہوگا۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث انہوں نے فوراً بعد بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قیامت کے دن تم میں سے کسی کا خزانہ قوت والا گنجا سانپ ہوگا جس کی آنکھ پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور وہ کہے گا: میں تیرا خزانہ ہوں“ (1)۔ مہلب نے کہا: اس باب میں امام بخاری نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بتائیں کہ ہر وہ حیلہ جو کوئی آدمی اسقاط زکوٰۃ کے لیے اختیار کرے گا تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا، کیونکہ جب نبی کریم ﷺ نے زکوٰۃ کے خوف سے ریوڑ کو جمع کرنے اور علیحدہ علیحدہ کرنے سے منع فرمایا ہے تو اس سے یہی مفہوم سمجھ آجاتا ہے۔ اور آپ کے ارشاد أفلح إن صدق سے بھی یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی کو کم کرنے کے لیے کوئی حیلہ اختیار کیا تو وہ فلاح نہیں پائے گا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا یہ عذر قابل قبول ہوگا۔ اور جس نے سال پورے ہونے کے قریب مال میں صاحب مال کے تصرف کو جائز قرار دیا ہے تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں کہ اس طرح وہ زکوٰۃ سے فرار اختیار کرے۔ اور جس نے ایسا اس نیت سے کیا تو اس پر سے اس کا گناہ ساقط نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، اسی طرح ہے جیسا کہ کوئی آدمی رمضان کے چاند کے طلوع سے ایک دن قبل رمضان کے روزے سے بچنے کے لیے کوئی ایسا سفر اختیار کرلے جس سفر کی اسے ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرض سے اعراض مقصود ہے جو اس نے مومنین پر لازم قرار دیا ہے، تو اس پر وعید صادق آئے گی، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قیامت کے دن جان بوجھ کر زکوٰۃ سے روکنے کی سزا کیا ہوگی اسے اونٹ کیسے روندے گا اور اس کے مال کو اس کے لیے قوت والے گنجے سانپ کی تمثیل دی جائے گی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ سے فرار جائز نہیں اور آخرت میں اس کا مطالبہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا: بعض شافعی علماء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ کے بارے میں کہا کہ یہ مباح کام کے لیے حیلہ اختیار کرنے پر دلیل ہے۔ مگر یہ بہت بڑا وہم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ (یوسف: 21) کے بارے میں رکھا گیا ہے کہ کما مکنا لیوسف ملك نفسه عن امرأة العزيز مكنا له ملك الأرض عن العزيز یعنی جس طرح ہم نے عزیز کی بیوی سے خود یوسف کو اپنے اوپر ملکیت وتسلط بخشا اسی طرح عزیز سے حکومت کی ملکیت واقتدار بھی یوسف کو بخش دیا۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ (ص: 44) ہے۔ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک جھاڑو لے کر اسے ماریں اور حانث نہ ہوں۔ لیکن یہ حیلہ نہیں بلکہ یہ تو قسم کو الفاظ یا مقاصد پر محمول کرنا ہے۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح حضرت ابو سعید خدری والی وہ حدیث ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوریں لے آیا۔ الحدیث۔ اس حدیث کو بیان کرنے سے شافعیہ کا مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے ساری کھجوریں بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور پھر جس آدمی کو بیچیں ہیں اس سے یا کسی اور سے جنیب کھجوریں خریدنے کا حکم ارشاد فرمایا جبکہ مالکیہ نے کہا: اس کا مقصود ہی اور ہے اور وہ یہ کہ تاکہ جنیب اور درا ہم جمع نہ ہو جائیں جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غلہ، غلہ کے بدلے میں اور درا ہم سود ہیں۔

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 379

فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِكِ یعنی بادشاہ کی بادشاہت میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عیسیٰ سے اس کا معنی بادشاہ کی عادات میں، روایت ہے یعنی وہ بغیر دلیل کے ظلم کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فی حکمه اور وہ ہے چوروں کو غلام بنالینا۔ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اس کی خورجی میں پیالے کے رکھنے کے لیے کوئی علت اور عذر بنادے۔ قتادہ نے کہا: بلکہ بادشاہ کا فیصلہ مارنے اور جرمانہ کرنے کا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کی زبانوں پر بنی اسرائیل کا حکم (چوروں کا غلام بنانا) جاری ہو گیا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ یعنی علم وایمان کے ذریعے اس کو نَرۡفَعُ دَرَجٰتِ مَنۡ نَّشَآءُ بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی ہے نرفع من نشاء درجات، سورۃ الانعام میں یہ گزر چکا ہے۔ وَ فَوۡقَ كُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ اسرائیل نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کیا ہے کہ یہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور وہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر علم والے سے اوپر ہے (1)۔ سفیان نے عن عبد الاعلی عن سعید بن جبیر روایت کیا ہے (2) انہوں نے کہا: ہم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھے آپ نے گفتگو کی تو ایک آدمی نے حیرانگی کا اظہار کیا اور کہا: سبحان اللہ! وَ فَوۡقَ كُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کتنی بری بات تو نے کی ہے؟ اللہ علیم ہے اور وہ ہر عالم سے برتر ہے۔

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِهٖ وَ لَمۡ یُبۡدِهَا لَهُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ۝ قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الۡعَزِیۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیۡخًا كَبِیۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوۡنَ ۝

”بھائی بولے: اگر اس نے چوری کی ہے (تو کیا تعجب ہے) بے شک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے پس چھپا لیا اس بات کو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے جی میں اور نہ ظاہر کیا اسے ان پر (جی ہاں) کہا: تم بہت بری جگہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگے: اے عزیز! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا) پس ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے، بے شک ہم تجھے نیکوکاروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے کہا: ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ پکڑ لیں ہم مگر اس کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے ورنہ ہم ظالم ہوں گے“۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ معنی یہ ہوگا: یعنی اس نے اپنے بھائی کی پیروی کی ہے، اگر ہماری پیروی کرتا تو چوری نہ کرتا۔ انھوں نے یہ صرف اس لیے کہا تا کہ وہ اس کے فعل سے بری ہوں جائیں، کیوں کہ وہ ان کی ماں کا بیٹا نہیں تھا۔ اور اگر اس نے چوری کی ہے تو اس نے اپنے چور بھائی کا اثر قبول کر لیا ہے۔ کیونکہ نسب میں اشتراک اخلاق پر

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 35
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 34

بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اس چوری کے بارے میں اختلاف ہے جس کی نسبت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی ہے؛ مجاہد وغیرہ سے روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی حضرت اسحٰق کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی بڑی تھی، اس کے بڑے ہونے کی وجہ سے حضرت اسحٰق کا پٹکا اس کے پاس تھا کیونکہ وہ عمر کے اعتبار سے وارث بنتے تھے یہ حکم ہماری شریعت کے ذریعے منسوخ ہوگیا ہے تو وہ پٹکا جس نے چوری کیا تھا اسے غلام بنالیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور وہ آپ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتی تھی جب آپ کی پرورش مکمل ہوگئی اور آپ بڑے ہوگئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں کہا: یوسف کو میرے حوالے کردو، میں اس کو اپنی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل نہیں رکھ سکتا؛ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور اس کی جدائی کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ تو آپ کی بہن نے آپ کو کہا: کچھ دن اسے میرے پاس چھوڑ دو تاکہ میں اس کا دیدار کرسکوں، جب حضرت یعقوب علیہ السلام باہر گئے تو اس نے حضرت اسحٰق کا پٹکا لیا اور اسے حضرت یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، پھر کہا: حضرت اسحٰق کا منطقہ گم ہوگیا ہے، اسے تلاش کرو کس نے لیا ہے؟ اس نے تلاش کیا پھر کہا: گھر والوں کے کپڑوں میں تلاش کرو، تلاشی لی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے ملا۔ تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! اب یہ میرا ہے میں اس کے ساتھ جو چاہوں وہ سلوک کروں پھر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کے پاس آئے تو اس نے آپ کو بھی اس کے بارے میں بتایا، تو آپ نے اس کو کہا: اگر اس نے ایسا کیا ہے تو اس کو تیرے سپرد کرتا ہوں؛ پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئیں۔ اس وجہ سے آپ کے بھائیوں نے یہ کہا: اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ اسی سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کی خورجی میں پیالہ رکھنے کا طریقہ سیکھا کیونکہ آپ کی پھوپھی نے بھی آپ کو اپنے ہاں رکھنے کے لیے ایسا ہی کیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا(1): حضرت یوسف علیہ السلام کی ماں نے آپ کو اپنے نانا کے بت چوری کرنے کا حکم دیا، آپ نے انہیں چوری کیا، توڑا اور راستے پر پھینک دیئے، ماں، بیٹے کا یہ عمل برائی کو ختم کرنے کے لیے تھا، اسی چوری کی طرف بھائیوں نے نسبت کی تھی۔ حضرت قتادہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ زجاج کی کتاب میں ہے: وہ سونے کا بت تھا۔ عطیہ عوفی نے کہا: آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھانے کے دسترخوان پر تھے کہ آپ نے گوشت کا ایک ٹکڑا دیکھا تو اسے چھپالیا اس وجہ سے انہوں نے چوری کی نسبت کردی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کھانے کے دسترخوان سے مساکین کے لیے چرا لیتے تھے؛ اس کو ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی طرف چوری کی نسبت کرکے آپ پر الزام تراشی کی ہے یہی حضرت حسن نے کہا ہے۔

فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی بات اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ کو اپنے جی میں چھپالیا۔ یہ ابن شجرہ اور ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے اپنی بات اَنْتُمْ شَرٌّ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 36

مَكَانًا کو اپنے جی میں چھپالیا پھر اس کو ظاہر کرتے ہوئے کہا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہے یعنی تم نے جس کی طرف اس چوری کی نسبت کی ہے اس سے بہت بری جگہ پر ہو۔ اور وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے یہ جھوٹ ہے، اور اگر ہے بھی تو اللہ کی مرضی سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے بھائی انبیا نہیں تھے۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ انہوں نے آپ کو عزیز کے نام سے مخاطب کیا کیونکہ اس وقت وہ پہلا معزول ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ اور ان کے قول: اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا سے مراد قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا ہے نہ کہ عمر کے اعتبار سے۔ فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ یعنی اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو غلام بنا لو۔ ایک قول کے مطابق یہ مجاز ہے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس پر غلامی کا حکم ثابت ہو چکا ہے اس کی جگہ کسی اور کو غلام بنانا جائز نہیں۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کسی کے کام کو ناپسند کرتے ہوئے اسے کہیں: تم مجھے قتل کر دو مگر اس طرح نہ کرو، تو اس سے تمہاری یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ تمہیں قتل کر دے بلکہ اسے اس کام سے روکنے میں مبالغہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ کہنا حقیقت پر مبنی ہو؛ تو ایسی صورت میں ان کے انبیاء ہوتے ہوئے (اگرچہ پہلے گزر چکا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ نبی نہ تھے) ان کا کسی آزاد کو غلام بنا لینے کی بات کرنا بعید از قیاس ہے، تو اس سے مراد یہی ہوگا کہ انہوں نے ایسا کہا کہ بنیامین کی آزادی کا ایک حیلہ اختیار کیا؛ یعنی اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو پکڑ لو یہاں تک کہ آپ تک آپ کے صاحب کو لوٹا دیا جائے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بنیامین اپنے باپ تک پہنچ جائے اور حضرت یعقوب علیہ السلام حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں؛ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بات کو رد کر دیا کیونکہ حدود وغیرہ میں ضمانت۔ وہ بھی صرف مضمون کو حاضر کرنے کی۔ باہم رضامندی سے جائز ہے لازم نہیں۔

جبکہ ایسی ضمانت کہ جس میں ضامن پر وہ سزا لاگو کر دی جائے جو مضمون پر تھی یہ بالاجماع جائز نہیں۔ اور ''الواضحۃ'' میں ہے کہ کفالت بالوجہ تمام حدود میں جائز ہے، سوائے نفس کے اور جمہور فقہاء کے نزدیک نفس میں بھی جائز ہے البتہ امام شافعی کا اختلاف ہے انہوں نے ایک مرتبہ اسے ضعیف قرار دیا اور ایک مرتبہ جائز قرار دیا ہے۔

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ جو تمام معاملات میں آپ نے ان کے ساتھ سلوک کیا اس کا انہوں نے اظہار کیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ اگر آپ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ مہربانی کر دیں تو ہم اس کو اپنے اوپر بہت بڑا احسان خیال کریں گے۔ یہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تاویل ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یہ مصدر ہے اَنْ نَّاْخُذَ محل نصب میں ہے؛ یعنی من ان ناخذ، اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا، ناخذ کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ یعنی ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بری کو مجرم کے بدلے پکڑ لیں، اور تمہارے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کریں۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ یعنی اس کے علاوہ کسی اور کو پکڑنے کی صورت میں ہم ظلم کرنے والے ہوں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے۔ ان کے بڑے بھائی نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے لیا تھا تم سے وعدہ جو پختہ کیا گیا تھا اللہ کے نام سے اور اس سے پہلے جو زیادتی یوسف کے حق میں تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہیں یاد ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک کہ اجازت نہ دیں مجھے میرے باپ یا فیصلہ فرمائے اللہ تعالیٰ میرے لیے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے''۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ یعنی وہ مایوس ہو گئے یہاں اسْتَيْـَٔسُوْا بمعنی ییئسوا ہے جیسے عجب اور استعجب، سخر اور استسخر دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ خَلَصُوْا یعنی وہ علیحدہ ہو گئے اور وہ ان کے ساتھ نہیں تھا نَجِيًّا، خَلَصُوْا میں پائی جانے والی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ واحد ہے اور جمع کا معنی دے رہا ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے اور اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے جیسے وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ (مریم) اس کی جمع أنجية آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

إِنِّيْ إِذَا مَا الْقَوْمُ كَانُوْا أَنْجِيَةْ وَاضْطَرَبَ الْقَوْمُ اضْطِرَابَ الْأَرْشِيَةْ

هُنَاكَ أَوْصِيْنِيْ وَلَا تُوْصِيْ بِيَهْ

ابن کثیر نے استایسوا، ولا تایسوا۔ إنه لا یایس، أفلم یایس پڑھا ہے یعنی بغیر ہمزہ کے الف کے ساتھ؛ یعنی پہلے ہمزہ اور بعد میں یا پھر ہمزہ کو الف سے بدل دیا کیونکہ یا ساکن ماقبل مفتوح تھا جبکہ اصل جماعت کی قرات ہے کیونکہ مصدر یا کی تقدیم کے ساتھ ہی آتا ہے یأسا اور الإیاس، أیس کا مصدر نہیں بلکہ یہ أُسْتُهٗ أَوْسًا وإِيَاسًا کا مصدر ہے جس کا معنی ہے اعطیتہ میں نے اسے عطا کیا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: أیس اور یئس دونوں لغتیں ہیں؛ یعنی جب وہ اپنے بھائی کو لوٹانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا جس میں ان کے علاوہ کوئی اور آدمی شامل نہیں تھا، اور جو مسئلہ انہیں درپیش تھا اس میں انہوں نے باہم سرگوشی کی۔ اور نجی فعیل بمعنی مناجی ہے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ حضرت قتادہ نے کہا: وہ روبیل تھا، جو عمر میں ان سے بڑا تھا۔ مجاہد نے کہا: وہ شمعون تھا(1)، کیونکہ وہ رائے میں بڑا تھا۔ کلبی نے کہا: وہ یہوذا تھا، کیونکہ وہ ان میں زیادہ عقلمند تھا۔ محمد بن کعب اور ابن اسحاق نے کہا: وہ لاوی تھا، کیونکہ وہ ابو الانبیاء تھا۔ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی اپنے بیٹے کی حفاظت اور اس تک اسے واپس لوٹانے کا عہد جو اللہ کے نام سے پختہ کیا گیا تھا۔ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ، ما، أن پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہوگا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے وعدہ لیا ہوا ہے جو اللہ کے نام کے ساتھ پختہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 43

کیا گیا ہے، اور تم یوسف کے بارے میں اپنی زیادتی کو جانتے ہو؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے اور مِنۡ قَبۡلُ میں مِنۡ، تَعۡلَمُوۡا کے متعلق ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا زائدہ ہو۔ اور مِنۡ قَبۡلُ اور فِیۡ یُوۡسُفَ میں پائے جانے والے حروف جر فعل فَرَّطۡتُّمۡ کے متعلق ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا اور فعل مصدر ہوں اور مِنۡ قَبۡلُ فعل مضمر کے متعلق ہو؛ تقدیر عبارت یہ ہو: تفریطکم فی یوسف واقع من قبل؛ ما اور فعل مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوں اور خبر وہ فعل مضمر ہو جس کے متعلق مِنۡ قَبۡلُ ہے۔ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ یعنی اس سرزمین کو لازم پکڑوں گا اور اسی میں مقیم رہوں گا؛ برح براحا وبرُوحا کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ''زال'' اور جب اس پر نفی داخل ہو جائے تو یہ مثبت بن جاتا ہے۔ حَتّٰی یَاۡذَنَ لِیۡۤ اَبِیۡۤ یعنی میرا باپ مجھے واپس لوٹنے کی اجازت دے دے کیونکہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔ اَوۡ یَحۡکُمَ اللّٰہُ لِیۡ یعنی اللہ تعالیٰ بھائی کے ساتھ واپس لوٹنے کا فیصلہ فرمادے تو میں اس کے ساتھ اپنے باپ کے پاس جاؤں گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تلوار کے ذریعے فیصلہ فرمادے تو میں جنگ کروں گا اور اپنے بھائی کو حاصل کروں گا یا پھر عاجز آجاؤں تو کسی عذر کے ساتھ تو واپس پلٹوں گا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا لتأتننی بہ إلا أن یحاط بکم اور جس نے جنگ کی اور عاجز آ گیا تو گویا اسے گھیر لیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہوذا جب غصے میں ہوتا اور تلوار لے لیتا تو ایک ہزار آدمی بھی اسے واپس نہ کرسکتا؛ وہ اپنے بال سینے پہ ڈال لیتا۔ حدیث میں ہے کہ یہوذا نے اپنے بھائیوں کو کہا۔ اور یہ غصے کے حوالے سے سب سے زیادہ سخت تھا۔ یا تم بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہو جاؤ اور میں اہل مصر کے لیے کافی ہوں یا پھر تم اہل مصر کا بندوبست کرو اور میں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہوں؛ انہوں نے کہا: آپ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کا بندوبست کرو جبکہ ہم اہل مصر کے لیے کافی ہیں؛ تو اس نے ایک بھائی کو بھیجا کہ مصر کے بازار گن کر آؤ تو اس نے مصر میں نو بازار دیکھے، تو ان میں سے ہر ایک نے ایک بازار کو لے لیا؛ پھر یہوذا حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گیا اور کہا: اے بادشاہ! اگر تو نے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہ بھیجا تو میں ایسی چیخ ماروں گا کہ جس کی وجہ سے تیرے شہر کی حاملہ عورتیں اپنے حمل گرادیں گی؛ اور یہ ان میں بالخصوص غصہ کے وقت ہوتا تھا؛ اس بات نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی غصہ دلا دیا۔ تو یہوذا غصے میں آ گیا اور اس کا غصہ شدت اختیار کر گیا، اس کے بال کھڑے ہو گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹوں کی یہی حالت تھی جب انہیں غصہ آتا تو ان کی جلد کانپنے لگتی، جسم پھول جاتا اور ان کی پیٹھ کے بال کپڑوں سے نیچے سے ظاہر ہو جاتے، یہاں تک کہ ہر بال سے خون کا قطرہ بہنے لگتا اور اگر وہ زمین پر پاؤں مار دیتا تو زلزلہ بپا ہو جاتا تھا اور عمارتیں گر جاتی تھیں، اور اگر وہ چیخ مارتا تو عورتوں، جانوروں اور پرندوں میں سے جو بھی اسے سن لیتا وہ اپنے پیٹ میں جو کچھ ہوتا اسے گرا دیتا تھا، پھر اس کا غصہ تب تک نہیں تھمتا تھا جب تک کہ وہ خون نہ بہتا یا پھر نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کوئی ہاتھ اسے نہ روکتا؛ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو پتہ چل گیا کہ ان کے بھائی یہوذا کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے تو آپ نے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ قبطی زبان میں گفتگو کی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنا ہاتھ یہوذا کے دونوں کندھوں کے درمیان اس طرح رکھے کہ وہ دیکھ نہ پائے؛ تو بچے نے اسی طرح کیا تو یہوذا کا غصہ ختم ہو گیا، اس نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنے دائیں

بائیں دیکھا کہ شاید اسے اپنے بھائیوں میں سے کوئی نظر آئے لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا؛ تو وہ جلدی جلدی اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور کہا: کیا تم میں سے کوئی میرے پاس آیا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں؛ اس نے کہا: شمعون کہاں چلا گیا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ پہاڑ کی طرف گیا ہے: وہ نکلا اور اس کو مل گیا، اور وہ ایک بڑی چٹان کو اٹھا رہا تھا؛ اس نے کہا: اس کے ساتھ کیا کر دو گے؟ اس کو اس بازار میں لے کر جاؤں گا جو میرے حصے میں آیا ہے اور اس کے ذریعے بازار میں موجود ہر آدمی کو کچل دوں گا اس نے کہا: واپس لوٹ اور اسے چھوڑ دے یا اسے دریا میں پھینک دے، تو اس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا، اس ذات کی قسم جس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا ہے؛ مجھے نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کسی ہاتھ نے مس کیا ہے پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام پکڑنے کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ سخت تھے آپ نے فرمایا: اے عبرانیو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ قوت میں تم سے زیادہ کوئی نہیں پھر طاحونہ کے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر آپ نے لیا اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور اسے دیوار کے پیچھے پہنچا دیا۔ الوکل کا لفظ یہاں استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے پاؤں سے ٹھوکر مارنا وقد رکلہ یرکلہ یہ جوہری کا قول ہے۔ پھر یہوذا کو آپ نے اپنے ایک ہاتھ سے پکڑا اور اپنے پہلو میں کھینچ لیا، اور کہا: میرے پاس لوہے کی سلاخیں لے آؤ میں ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹوں اور ان کی گردنیں اڑا دوں؛ پھر آپ اپنے تخت پر براجمان ہوئے اپنی مسند پر بیٹھے اور اپنے ہیٹ کے بارے میں حکم فرمایا تو وہ آپ کے سامنے رکھا گیا تو اس سے گھنٹی کی آوازیں آئیں، آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: یہ کہہ رہی ہے کہ ان کے باپ کے دل پر جو پریشانی، غم اور کرب ہے وہ انہی کی وجہ سے ہے پھر دوبارہ آواز آئی اور آپ نے فرمایا: یہ آواز مجھے بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ایک چھوٹے بھائی کو پکڑا، حسد میں مبتلا ہوئے اور اسے اپنے باپ سے چھین لیا اور پھر اسے ضائع کر دیا۔ انہوں نے کہا: اے عزیز! ہماری پردہ پوشی کر اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے گا، ہمارے اوپر احسان کر اللہ تعالیٰ تیرے اوپر احسان کرے گا۔ پھر تیسری مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ آواز بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو کنوئیں میں پھینکا ہے، پھر اسے انتہائی سستا غلاموں کی قیمت پر بیچ دیا، اور اپنے باپ کو بتایا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے، پھر چوتھی مرتبہ صدا آئی تو آپ نے فرمایا: اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ اسی سال سے گناہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے انہوں نے استغفار نہیں کیا اور نہ ہی توبہ کی ہے، پھر پانچویں مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا: یہ کہتی ہے کہ جس بھائی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا ہے چند دنوں میں وہ واپس لوٹے گا اور ان کی کاروائی سے لوگوں کو آگاہ کرے گا۔ پھر چھٹی مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کہہ رہی ہے: اگر تم انبیاء یا انبیاء کی اولاد ہوتے تو تم نے جھوٹ نہ بولا ہوتا اور نہ ہی اپنے والد کی نافرمانی کی ہوتی۔ میں تمہیں سارے جہانوں کے لیے ضرور عبرت بناؤں گا، میرے پاس سلاخیں لاؤ میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹوں تو انہوں نے آہ و زاری کی، روئے اور توبہ کی اور کہنے لگے: اگر ہمیں بھائی یوسف علیہ السلام مل جائے اگر وہ زندہ ہے تو ہم اس کے تابعدار بن جائیں گے اور ہم مٹی بن جائیں گے جسے وہ اپنے پاؤں سے روندے گا؟ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف سے اس منظر کو دیکھا تو آپ رو پڑے اور انہیں فرمایا: میرے پاس سے

چلے جاؤ! میں نے تمہارے باپ کی عزت کی خاطر تمہیں چھوڑ دیا اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دیتا۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

''تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر (انہیں یہ) عرض کرو: اے ہمارے محترم باپ! بلاشبہ آپ کے بیٹے نے چوری کی (اس لیے وہ گرفتار کر لیا گیا) اور ہم نے (آپ سے) وہی کچھ بیان کیا جس کا ہمیں علم تھا اور ہم نہیں تھے غیب کی نگہبانی کرنے والے''۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ کا قول اسی نے کہا جس نے فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ کہا تھا فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ضحاک اور ابورزین نے اس کو ان ابنك سرق پڑھا ہے، نحاس نے کہا: مجھے محمد بن احمد بن عمر نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ابن شاذان نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن ابی سریج بغدادی نے بیان کیا انہوں نے کہا: میں نے کسائی کو یا أبانا إن ابنك سرق پڑھتے ہوئے سنا ہے، یعنی سین کے ضمہ اور راء مکسورہ کی شد کے ساتھ، یعنی تیرے بیٹے کی طرف چوری کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے خونته، و فسقته و فجرته کہا جاتا ہے جب ان عادات کی طرف کسی کی نسبت کی جائے۔ زجاج نے کہا: سرق میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس سے چوری کا پتہ چلا ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر چوری کی تہمت لگی ہے۔ جوہری نے کہا السرق اور السرقة راء مکسورہ کے ساتھ یہ اس چوری شدہ چیز کو کہتے ہیں اور سَرَقَ يَسْرِقُ کا مصدر فتحہ کے ساتھ آتا ہے۔

وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا ان کی مراد یہ تھی کہ انہوں نے وہی کچھ بیان کیا جس کا ان کو علم تھا۔ اور جہاں تک اب کی صورت حال ہے تو ہم نے ظاہر کی گواہی دی ہے اور ہم غیب کو نہیں جانتے، گویا بنیامین کے قول: میری خورجی میں اسے اس نے رکھا ہے جس نے تمہاری خورجیوں میں تمہارا سامان رکھا، نے تمہیں تہمت میں مبتلا کر دیا؛ اس کا یہ معنی ابن اسحق نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ ما شهدنا عند يوسف بأن السارق يسترق إلا بما علمنا من دينك یہ ابن زید کا قول ہے۔ وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ یعنی جس وقت ہم نے اسے آپ سے لیا ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ چوری کرے گا ورنہ ہم اسے لیتے ہی نہ۔ مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا: ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا اور ہمارے اس کام کا یہ انجام ہوگا۔ اور ہم نے تو صرف یہ کہا تھا: ہم اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی مراد یہ تھی (1) کہ اس نے رات کے وقت چوری کی ہے جبکہ وہ سو رہے تھے اور حمیر کی لغت میں غیب سے مراد رات ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے: ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ اپنی رات، دن اور آنے جانے میں کیا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: جب تک ہمارے سامنے رہا کوئی گڑبڑ نہ ہوئی اور جب ہم سے غائب ہو گیا تو اس کے حالات ہم

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 46

سے پوشیدہ ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے: چوری کا سامان اس کی خورجی سے پکڑا گیا ہے۔ اور ہم نے اس سامان کو نکالا اور اس کی طرف دیکھتے رہے اور ہمیں غیب کا کوئی علم نہیں۔ شاید انہوں نے اس کی طرف چوری کو منسوب کر دیا ہو اور اس نے چوری نہ کی ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جس طرح بھی پتہ چل جائے اس کی شہادت دینا جائز ہے، کیونکہ شہادت کا تعلق عقلاً اور شرعاً علم کے ساتھ ہے، لہٰذا یہ صرف اسی سے سنی جاتی ہے جس کو اس کا علم ہو، اور انہیں کی طرف سے اسے قبول کیا جاتا ہے۔ شہادات کے سلسلہ میں یہ قانون ہے، اسی وجہ سے ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: اندھے کی گواہی جائز ہے، کوشش کر کے سننے والے کی شہادت جائز ہے، اور گونگے کی شہادت جبکہ اس کا اشارہ سمجھ آ جائے جائز ہے، اسی طرح خط پر شہادت بشرطیکہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اس کا خط ہے یا فلاں کا خط ہے صحیح ہے پس ہر وہ آدمی جسے کسی چیز کا علم ہو جائے تو اس کے لیے شہادت دینا جائز ہوگی اگرچہ اسے اس پر گواہ نہ بھی بنایا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ** (الزخرف) یعنی مگر وہ جس نے سچی گواہی دی اس حال میں کہ وہ جانتے ہوں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میں تمہیں گواہوں کی اچھائی کے متعلق بتاؤں، گواہوں کی بھلائی یہ ہے کہ وہ گواہی دیں قبل اس کے کہ ان سے گواہی کے بارے میں پوچھا جائے''(1)۔ اس کی تفصیل سورۃ ''البقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ گزرنے والے کی شہادت کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کہے: میں فلاں کے پاس سے گزرا تو میں نے اسے یوں کہتے ہوئے سنا تو اگر اس نے پوری بات کو سن لیا ہو تو وہ شہادت دے سکتا ہے جبکہ امام مالک کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب تک اسے گواہ نہ بنایا جائے تب تک وہ گواہی نہیں دے سکتا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ پوری بات سمجھ آ جانے کی صورت میں ادائے شہادت درست ہے۔ یہی علماء کی جماعت نے کہا ہے۔ اور یہی حق ہے، کیونکہ اس صورت میں اس نے مطلوب کو حاصل کر لیا ہے، اور اس پر علم کی ادائیگی لازم ہو چکی ہے، پس گواہوں کی بھلائی اس میں ہے جب وہ اس کو ظاہر کر دیں اور برائی اس میں ہے جب وہ اس کو چھپا لیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ جب کسی آدمی نے ایسی گواہی دی کہ اس کی عمر اس کی متحمل نہیں تھی تو اس کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ اس نے باطل دعویٰ کیا ہے اور ظاہر نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے اور (پوچھیے) اس قافلے سے جس میں ہم آئے اور یقیناً ہم سچ عرض کر رہے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ **وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ** اس کے ذریعے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس اپنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، بیان خیر الشھود، جلد 2، صفحہ 77

شہادت کو ثابت کر رہے ہیں اور اپنے آپ سے الزام کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ آپ ان پر الزام نہ لگائیں ۔اور وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ سے مراد اہل قریہ ہیں مضاف محذوف ہے اور قریہ سے مراد مصر ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جس میں وہ اترے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ قریہ اگرچہ جمادات پر مبنی ہے مگر آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جمادات کو بھی آپ کی خاطر زبان عطا فرمائے گا اور وہ گفتگو کریں گے۔ اگر یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر اضمار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سیبویہ نے کہا: کلم هند کہہ کر غلام هند مراد لینا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ اشکال کا باعث ہے اور الْعِيْرَ میں وہی گفتگو ہے جو الْقَرْيَةَ میں تھی۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ یعنی اپنی بات میں ہم سچے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں فقہ کا ایک قاعدہ بھی ہے کہ ہر وہ آدمی جو حق پر ہے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر نہیں یا اس کا خیال ہو کہ اس طرح وہ تہمت و الزام کو دور کر سکتا ہے اور اس حق کی وضاحت کر سکتا ہے جس پر وہ ہے تو اسے ایسا کر لینا چاہیے تاکہ کسی کا کوئی اعتراض باقی نہ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت صفیہ کے ساتھ مسجد سے انہیں رخصت کرتے ہوئے گزرتے ہوئے دو آدمیوں کو یہ کہہ کر کہ "یہ صفیہ بنت حی" ہے (1) ایسا ہی کیا، تو ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ! اور ان پر یہ بات گراں گزری، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شیطان انسان کے خون تک پہنچ جاتا ہے اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ تمہارے دل میں کوئی تہمت نہ ڈال دے"۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

"آپ نے (یہ سن کر) کہا: بلکہ آراستہ کر دی ہے تمہارے لیے تمہارے نفسوں نے یہ بات، (میرے لیے) اب صبر ہی زیبا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو، بے شک وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ یعنی اس نے آراستہ کر دیا لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اس بات کو کہ میرے بیٹے نے چوری نہیں کی، بلکہ یہ تو صرف ایسے کام کے لیے ہوا ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ یعنی میرا طریقہ صبر جمیل ہے یا صبر جمیل ہی مجھے زیبا ہے جس طرح کہ سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے اس کی اولاد کو یا اس کے مال کو کوئی مصیبت لاحق ہو تو صبر جمیل کے ذریعے تسلی حاصل کرے اسی طرح اس حلیم و حکیم کی رضا اور تسلیم کو حرز جان بنائے اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام اور سارے انبیاء کی پیروی کرے۔ سعید بن ابی عروبہ نے عن قتادہ عن حسن کہا ہے: بندے کے دو گھونٹوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ گھونٹ نہیں جن کو بندہ بھرتا ہے ایک وہ مصیبت کا گھونٹ جس کو بندہ خوبصورت صبر اور خوبصورت تسلی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصیام، هل یخرج المعتکف لحوائجه، جلد 1، صفحہ 272

کے ذریعے بھرتا ہے اور دوسرا وہ غصہ کا گھونٹ جس کو بردباری اور عفو کے ذریعے بھرتا ہے۔ ابن جریج نے مجاہد سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کے بارے میں کہا: یعنی میں کسی کو بھی اس کی شکایت نہیں کروں گا۔ مقاتل بن سلیمان نے عطا بن ابی رباح عن ابی ہریرہ عن رسول اللہ ﷺ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے کسی کو آگاہ کر دیا اس نے صبر نہیں کیا''۔ اور سورۃ ''البقرہ'' میں گزر چکا ہے کہ صبر صدمہ کے آغاز میں ہوتا ہے۔ اور ثواب اسے حاصل ہوتا ہے جس نے مصیبت کا ذکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اگرچہ مصیبت کا وقت گزر ہی کیوں نہ چکا ہو۔ جویبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے سو شہیدوں کا ثواب عطا کیا گیا۔ اور اسی طرح اس امت میں سے جس نے مصیبت کو برداشت کیا تو اس کو بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اجر جیسا اجر دیا جائے گا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا کیونکہ آپ کے نزدیک یہ بات ثابت تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا بلکہ صرف آپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں، کیونکہ جب یوسف کو اٹھایا گیا تو وہ غلام تھے خود اپنے لیے کسی چیز کے مالک نہیں تھے پھر بادشاہ نے انہیں خرید لیا تو آپ اس کے گھر رہتے تھے اور لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے پھر آپ کو قید میں ڈال دیا گیا اور جب قدرت حاصل ہوئی تو آپ نے ایک ایسا حیلہ کیا جس کے ذریعے آپ کے متعلق آپ کے باپ کو پتہ چل جائے۔ اور آپ نے قاصد کی طرف کوئی توجہ نہ دی کیونکہ آپ کے بھائیوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اس سلسلے کو پہنچاتے اور آپ نے بِهِمْ کہا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تین بھائی تھے: ایک حضرت یوسف علیہ السلام، آپ کا بھائی بنیامین اور تیسرا جو بنیامین کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا اور جس نے کہا تھا: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ یعنی میرے حال کو جانتا ہے۔ الْحَكِیْمُ اور جو کچھ گزر چکا اس میں دانا ہے۔

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ ﴿۸۴﴾

''اور منہ پھیر لیا آپ نے ان کی طرف سے اور کہا: ہائے افسوس! یوسف کی جدائی پر اور سفید ہو گئیں ان کی آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کیے ہوئے تھے''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ یعنی آپ نے ان سے اعراض کیا: اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام تک بنیامین کی خبر پہنچی تو آپ کی پریشانی بہت زیادہ ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے جو مصیبت آپ کو لاحق ہوئی تھی اسے تازہ فرما دیا۔ آپ نے فرمایا: یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ اور اپنے بیٹے بنیامین کو بھول گئے اس کا کوئی ذکر نہ کیا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف کے واپس لوٹنے کی امید نہیں تھی ورنہ آپ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ نہ کہتے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کا معنی یا حزناہ ہے (1)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: ''یا جزعاہ'' کثیر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 48

فیا أسفا للقلب كيف انصرافهُ وللنفسِ لمّا سلّيت فتسلّتِ

ہائے افسوس دل کے لیے اس کا پھیرنا کیسے ممکن ہوگا اور نفس کو جب میں نے تسلی دی تو اس نے تسلی پالی۔

الأسف فوت شدہ چیز پر شدت غم کو کہتے ہیں۔ اور ندا کا مطلب یہ ہوگا: اے افسوس آ کہ یہ تیرا وقت ہے۔ زجاج نے کہا: اصل میں یا اسفی تھا یا کو الف سے بدل دیا گیا فتحہ کی خفت کی وجہ سے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ کہا گیا ہے کہ چھ سال تک آپ نے نہ دیکھا اور آپ نابینا ہو گئے، یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آنکھ سفید ہو گئی مگر تھوڑا سا نظر آتا تھا اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کی حالت کو بہتر جانتا ہے۔ اور آپ کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سفید ہو گئیں اور چونکہ رونے کا سبب حزن تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْحُزْنِ کہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام آپ کے سامنے لمبے لیٹے ہوئے تھے تو آپ نے نیند میں خراٹا لیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام آپ کی طرف متوجہ ہوئے پھر دوبارہ خراٹا لیا تو دوبارہ متوجہ ہوئے پھر تیسری مرتبہ خراٹا لیا تو انتہائی خوشی و مسرت سے آپ نے توجہ فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی فرمائی: میرے صفی اور میرے خلیل کے بیٹے کو دیکھو کھڑا میری مناجات میں ہے اور دیکھتا غیر کو ہے۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں ضرور وہ دونوں آنکھیں چھین لوں گا جن کے ذریعے وہ متوجہ ہوا ہے۔ اور اس کے درمیان اور جس کی طرف اس نے توجہ کی اس کے درمیان اسی سال تک جدائی ڈال دوں گا تا کہ عالمین کو پتہ چل جائے کہ جو میرے سامنے کھڑا ہو تو اس پر میری نظر کی نگہبانی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ نماز میں توجہ۔۔ اگرچہ نماز کو باطل نہیں کرتی ..... مگر اس میں نقص اور پکڑ پر دلالت کرتی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں توجہ کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ وہ جھپٹنا ہے جو شیطان بندے کی نماز سے مار لیتا ہے'' (1)۔

سورۃ ''المومنون'' میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا کہ علماء اس حوالے سے کیا کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ نحاس نے کہا: اگر لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حزن کی شدت کے متعلق پوچھیں تو اس کے تین جوابات ہیں جو علماء نے بیان کیے ہیں۔

نمبر 1: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چلا کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں تو انہیں ان کے دین کا خوف لاحق ہوا۔ اس وجہ سے ان کی پریشانی شدت اختیار کر گئی۔

نمبر 2: ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ آپ نے بچپن میں انہیں بھائیوں کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے پریشان ہوئے اور اس پر شرمندہ بھی ہوئے۔

نمبر 3۔ یہ تیسرا جواب زیادہ واضح ہے اور وہ یہ کہ پریشانی کوئی ممنوع چیز نہیں ممنوع تو واویلا، کپڑوں کو پھاڑنا اور ایسا کام کرنا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، الالتفات فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 104

ہے جو نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آنکھیں بہتی ہیں دل پریشان ہوتا ہے اور ہم ایسی بات نہیں کہتے جو رب کو ناراض کر دے'' (1)۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے ارشاد: فَهُوَ كَظِيْمٌ کے ذریعے بیان فرما دیا۔ اس کا معنی ہے کہ حزن و پریشانی سے بھرا ہوا ہے اور اس پر کنٹرول کیے ہوئے اس کی شکایت اور اظہار نہیں کرتا اسی سے کظم الغیظ ہے اس سے مراد غصے کا چھپانا ہے۔ مکظوم سے مراد یہ کہ جس پر حزن کے راستے مسدود ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ (القلم) یعنی کرب و پریشانی سے بھرا ہوا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مکظوم بمعنی کاظم ہو اس سے مراد وہ ہے جو خوف پر مشتمل ہو اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کظیم سے مراد مغموم ہے۔ شاعر نے کہا:

فإنْ أَكُ كاظِمًا لِمُصابِ شَاسٍ فإنِّي اليومَ مُنطلِقٌ لِسانِي

ابن جریج نے مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کہ آپ نے فرمایا: آپ کی آنکھیں پریشانی کی وجہ سے چلی گئیں (2) فَهُوَ كَظِيْمٌ آپ نے فرمایا: فهو مكروب یعنی آپ رنج و مشقت میں تھے۔ مقاتل بن سلیمان نے عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فَهُوَ كَظِيْمٌ کے بارے میں کہا: فهو كمد آپ پوشیدہ پریشانی میں تھے۔ کہتے ہیں: آپ جانتے تھے کہ یوسف زندہ ہے جبکہ یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، اس وجہ سے آپ باطنی طور پر پریشان تھے۔ جوہری نے کہا: الكمد سے مراد پوشیدہ غم ہے۔ اس سے كَمِدَ الرجُلُ كَمِدٌ وكَمِيْدٌ کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ فلان كظيم و كاظم یعنی ایسا پریشان جو اپنی پریشانی کی شکایت نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

فَحَضَضْتُ قَوْمِي واحتسبتُ قِتالَهم والقومُ من خوف المَنَايا كُظَّم

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

''بیٹوں نے عرض کی: بخدا! آپ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں یوسف کو کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت یا آپ ہلاک نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں اور میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کو آپ کے بیٹے نے کہا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ کسائی نے کہا: فَتَأْتُ و فَتِئْتُ افعل ذالك یعنی مازلت۔ فراء کا خیال ہے کہ لا مضمرہ ہے یعنی لا تفتا اس نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

فقلتُ يمينُ الله أبرحُ قاعِدًا ولو قَطَعوا رأسي لدَيكِ وأوصالِي

یہاں ابرح اصل میں لا ابرح ہے۔ نحاس نے کہا: جو حسن نے کہا ہے وہ صحیح ہے۔ خلیل اور سیبویہ کا خیال ہے کہ ''لا'' قسم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ما جاء فی البکاء علی المیت، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث نمبر 1577، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 50

میں مضمر ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی اشکال نہیں اور اگر واجب ہوتا تو لام اور نون کے ساتھ ہوتا۔ اور آپ کے بیٹوں نے آپ کو یہ بات اس لیے کہی کیونکہ وہ یقین سے جانتے تھے کہ آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے؟ کہا جاتا ہے: مازال یفعل کذا اور مافتی اور فتأ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں انکار کے ساتھ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فما فَتِئتُ حتّی کأنّ غُبَارَھَا سُرادِقُ یومِ ذی ریاحٍ تُرَفَّعُ(1)

یعنی مابرحت فتفتتا تبرح۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تزال ہے۔

حَتّٰی تَكُوْنَ حَرَضًا یعنی آپ بیمار ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: بیماری کی وجہ سے قریب الموت ہونا مراد ہے اور یہ موت سے کم درجہ ہے۔ شاعر نے کہا:

سَرَی هَمّی فأمرضنی وقِدْمًا زادنی مَرَضَا
کذاكَ الحبُّ قبل الیومِ مِمّا یُورِثُ الحَرَضَا

قتادہ نے کہا: اس کا معنی بڑھاپا ہے(2)۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی نشان کا مٹنا ہوا اور محو ہونا ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: اس سے مراد ذہنی توازن کا کھونا ہے(3)۔ فراء نے کہا: حارض سے مراد فاسد الجسم اور فاسد العقل ہے۔ اسی طرح حرض کا معنی بھی یہی ہے۔ حضرت ابن زید نے کہا: حرض سے مراد ارزل العمر کی طرف لوٹنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہڈیوں پر جسم کا خشک ہو جانا مراد ہے مؤرج نے کہا: غم سے پگھلنا مراد ہے۔ اخفش نے کہا: غم سے چل بسنا مراد ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ہلاک ہونے والا معنی ہے۔ یہ تمام معنی قریب قریب ہیں۔ اور حرض کی اصل پریشانی عشق یا بڑھاپے کی وجہ سے جسم اور عقل میں فساد کا آجانا ہے عرجی نے کہا:

إنّی امرؤٌ لَجّ بی حُبٌّ فأحْرَضَنی حتّی بَلِیتُ وحتّی شَفَّنِی السَّقَمُ (4)

نحاس نے کہا: حَرَضَ حَرَضًا، حَرُضَ حُرُوضًا، حُرُوضَة کہا جاتا ہے جب آدمی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے بخار ہو جائے۔ اسی طرح رجل حارِض و حَرَض'' البتہ حرضا کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ اسی طرح قَمِن اور حری میں ان کا بھی تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ ثعلبی نے کہا: عربوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مذکر کے لیے حارض اور مؤنث کے لیے حارضہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں پس جب اس لفظ کے ساتھ وصف بیان کرتے ہیں تو تثنیہ جمع اور مؤنث استعمال کرتے ہیں۔ اور حَرِضَ یَحْرَضُ، حَرَاضَةً فهو حَرِیض، وحَرِضٌ کہا جاتا ہے اور ''رجل مُحْرَض'' کہا جاتا ہے شاعر نے کہا:

طَلَبَتْهُ الخیلُ یوما کاملا ولو اَلْفَتْهُ لَاَضْحَی مُحْرَضًا(5)

امرؤالقیس نے کہا:

أرَی المرءَ ذا الأذْوَادِ یُصْبِحُ مُحْرَضًا كَإحْرَاضِ بِكْرٍ فی الدّیارِ مَرِیضِ(6)

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 52 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54 3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 55
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54

نحاس نے کہا: اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ جب غم کسی کو بیمار کردے تو احرضہ الھم کہتے ہیں اور رجل حارض سے مراد احمق آدمی لیا جاتا ہے۔ انس نے حرضا حا کے ضمہ اور را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اشنان کی لکڑی کی طرح۔ حضرت حسن نے حا اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: الحَرَض والحُرُض دونوں کا معنی اشنان ہے۔ اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ یعنی مردہ۔ یہ ان سب کا قول ہے اور ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام رونے سے اور پریشان رہنے سے باز آجائیں یہ ان کی محبت پر دال ہے جبکہ اس کا سبب بھی وہی تھے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ لغت میں بث کی حقیقت وہ مہلک اشیاء ہیں جو انسان پر وارد ہوتی ہیں جن کو پوشیدہ رکھنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ بثثته سے مشتق ہے جسکا معنی ہے فرقته، تو مصیبت کو مجاز اً بث کہہ دیا گیا۔

ذوالرمہ نے کہا:

وَقفتُ على رَبْعٍ لِمَيّةَ نَاقَتي فما زِلْتُ أَبكِي عندَهُ وأُخَاطِبُهْ

وأَسْقِيه حتّى كاد مما أبثُّهُ تُكَلِّمُنِي أَحْجَارُهُ ومَلَاعِبُهْ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بثی سے مراد ہے ھمی میرا غم۔ حضرت حسن نے کہا: حاجتی، اپنی حاجت۔ ایک قول ہے: غم کی سختی، اور اس کی حقیقت وہی ہے جو ذکر کر دی گئی ہے۔ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ معطوف علیہ ہے۔ یہ اسی کا اعادہ ہے مترادف لفظ کے ذریعے۔ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے (1) اور میں اسے سجدہ کروں گا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے اپنے ساتھ احسانات کو جانتا ہوں جو مجھے اس کے ساتھ حسن ظن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام نے ملک الموت کو کہا: کیا تو نے یوسف کی روح قبض کر لی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو اس گفتگو نے آپ کی امید کو اور زیادہ پختہ کر دیا۔ سدی نے کہا: آپ اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپکے بیٹے نے آپ کو بادشاہ کی سیرت، عدل، اخلاق اور گفتگو کے بارے میں بتایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے سو آپ کو لالچ پیدا ہوا اور آپ نے کہا: شاید وہ یوسف ہو اور آپ نے کہا: زمین میں صدیق صرف نبی ہوتا ہے (2)۔ ایک قول یہ ہے: میں مجبور کی دعا کی قبولیت کو زیادہ جانتا ہوں جتنا تم نہیں جانتے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ''۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کو حضرت یوسف علیہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 57

1۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 61

السلام کی زندگی کا یقین تھا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں: یا تو خواب کے ذریعے، یا اللہ تعالیٰ نے بھیڑیے کو بولنے کی طاقت دی اور بھیڑیے نے بتایا جس طرح کہ واقعہ کی ابتدا میں ہے یا ملک الموت نے خبر دی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی روح کو قبض نہیں کیا اور یہ زیادہ ظاہر ہے۔ التحسس حواس کے ذریعے کسی چیز کو طلب کرنا ہے۔ یہ حس سے باب تفعل ہے یعنی اس آدمی کے پاس جاؤ جس نے تم سے تمہارا بھائی طلب کیا اور تم سے اسے لینے کا حیلہ اختیار کیا اور اس کے متعلق اور اس کے مذہب کے متعلق پوچھو اور روایت ہے کہ ملک الموت نے آپ کو کہا: اسے یہاں تلاش کرو! اور اس نے مصر کی جانب اشارہ کیا۔ اور ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام سامان کی واپسی، بھائیوں کی قید اور کرامت کے اظہار کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام پر آگاہ ہوئے اسی وجہ سے آپ نے انہیں مصر کی طرف ہی متوجہ کیا کسی اور طرف نہیں، وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کشادگی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ مومن اللہ کی کشادگی کی امید رکھتا ہے اور کافر سختی میں ناامید ہوتا ہے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا: روح اللہ سے مراد اللہ کی رحمت ہے (1)۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔ سورہ "الزمر" میں ان شاء اللہ اس کا بیان آئے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝۸۸

"پھر جب وہ گئے (یوسف) کے پاس تو انہوں نے عرض کی: اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو مصیبت اور (اس مرتبہ) ہم لے آئیں ہیں حقیری پونجی پس پورا ناپ کر دیں ہمیں پیمانہ اور (اس کے علاوہ) ہم پر خیرات بھی کریں، بے شک اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو"۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ یعنی روکنے والے مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یہ ان کے مصر آنے کی تیسری دفعہ تھی۔ کلام میں حذف ہے یعنی وہ مصر کی طرف نکلے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: مَسَّنَا یعنی ہمیں پہنچی ہے۔ وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یعنی بھوک اور حاجت، اس میں مصیبت یعنی بھوک کے وقت شکوہ کے جواز پر دلیل ہے، بلکہ جب فقر کی وجہ سے اسے اپنے اوپر کسی مصیبت کا خوف ہو تو اس پر واجب ہے۔ اور اس کے علاوہ جس آدمی سے نفع کی امید ہو اس کے سامنے اپنی حاجت کو ظاہر کرنا چاہیے، جس طرح کہ ڈاکٹر کے سامنے درد وغیرہ کی شکایت کرنا واجب ہے تاکہ وہ علاج کرے۔ اور یہ چیز توکل میں قدح کا باعث نہیں یہ اس صورت میں ہوگا جب شکوہ ناراضگی کی صورت میں نہ ہو۔ اور مصائب میں صبر اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اور سوال کرنے سے باز رہنا افضل ہے اور شکوہ میں عمدہ کلام یہ ہے کہ غلام کا سوال مصیبت کا زوال ہے اور یہی حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول ہے: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کی کاریگری کی خوبصورتی، مہربانی کی عجیب صورت اور اپنے بندوں پر اس کی توجہ، جہاں تک ایسے آدمی کے سامنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 61

شکوہ کرنے کا تعلق ہے جو اس کا ازالہ نہ کر سکے تو یہ بے وقوفی ہے، البتہ وہ فقط تسلی اور معاملے کو ظاہر کرنے کے لیے ہو تو (پھر درست ہے) جس طرح کے ابن درید نے کہا:

لَا تَحْسَبَنْ يَا دهرُ إِنِّي ضَارِعٌ لِنَكْبَةٍ تَعْرِقُنِي عَرْقَ الْمُدَى

مَارَسْتُ مَنْ لَوْ هَوَتِ الأفلاكُ مِنْ جَوَانِبِ الجوّ عليه ماشكا

لكنها نَفْثَةُ مَصْدورٍ إذا جَاشَ لُغَامٌ مِنْ نَوَاحِيهَا غَمَا

وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ۔ البضاعة سے مراد مال کا وہ ٹکڑا ہے جس کے ذریعے کسی چیز کی خریداری کا قصد کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: أبضعتُ الشیٔ واستبضعته یعنی میں نے اسے مال بنایا۔ ضرب المثل میں ہے: کمستبضع التمرالی ھجر (بحرین کا ایک شہر) مزجاۃ، بضاعۃ کی صفت ہے۔ الازجاء کسی چیز کو دور پھینک دینا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا (النور:43) ہے معنی یہ ہوگا کہ یہ مسترد کر دیا جانے والا مال ہے جس کو ہر ایک قبول نہیں کرتا۔ ثعلب نے کہا: البضاعۃ المزجاۃ سے مراد تھوڑا مال ہے جو پورا نہ ہو۔ یہاں اس کے تعین میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: وہ جنگلی جانوروں کے گوشت کے خشک ٹکڑے تھے۔ اس کو واقدی نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: کہ اس کا معنی رسیوں اور کپڑوں کی بوسیدگی ہے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ایک قول یہ ہے۔ بدوؤں کا سامان اون اور گھی تھا (2)۔ یہ عبداللہ بن حارث کا قول ہے۔ ایک قول ہے: سبز دانے اور صنوبر تھا اور وہ بطم ہے یعنی شام میں پائے جانے والے ایک درخت کا بیج ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے اور صابن بنانے کے لیے اس سے تیل بھی نچوڑا جاتا ہے یہ ابو صالح کا قول ہے۔ پس انہوں نے اسے دراہم کے بدلے بیچا جو کھانے میں مروج نہیں تھے اور لوگوں کے درمیان رائج تھے، تو انہوں نے کہا: اس نے ہم سے اسے ایسے عمدہ دراہم کے حساب سے لیا جو کھانے میں مروج ہوتے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ردی دراہم ہیں (3)، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر نہیں تھی جبکہ مصر کے دراہم پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر ہوتی تھی۔ اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد جوتے اور چمڑا ہے اور انہیں سے مروی ہے کہ وہ چھانا ہوا ستو تھا۔

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح عمدہ دراہم کے بدلے میں آپ بیچتے ہیں ہمارے دراہم کے بدلے میں بھی ہمارے لیے آپ اس میں کوئی کمی نہ کریں، یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ سے ان کی مراد وہ کیل تھا جو آپ پہلے اپنے بھائیوں کے لیے کر چکے تھے۔ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا یعنی عمدہ اور ردی سکوں کے بھاؤ کے حوالے سے ہمارے اوپر مہربانی کیجئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر، سدی اور حسن کا قول ہے۔ کیونکہ صدقہ تو اولاد انبیاء پر حرام ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا یعنی ہمارے حق سے زیادہ دے کر مہربانی کریں۔ یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 63　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 64　3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 65

سفیان بن عیینہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: صدقہ صرف ہمارے نبی پر حرام تھا۔ ابن جریج نے کہا: ہمارے بھائی کو ہماری طرف لوٹا کر مہربانی کیجئے (1)۔ ابن شجرہ نے کہا: تَصَدَّقْ عَلَيْنَا کا مطلب ہے کہ ہم سے درگزر فرمایئے۔ بطور استشہاد شعر کا شعر پیش کیا ہے:

تصدقْ علينا يا بن عفّان واحتَسِبْ	وأمِّرْ علينا الأشعري لَيَالِيَا

اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔ یہ تعریض ہے، کیونکہ ان کے نزدیک بادشاہ ان کے دین پر نہ تھا، اسی وجہ سے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ آپ کو اپنے صدقہ کی جزا دے گا، بلکہ انہوں نے ایسے لفظ بولے جن میں اس مراد کا وہم بھی ہے۔ اور ایسا وہم بھی ہے جس سے تاویل کے ذریعے ان کا نکلنا بھی ممکن ہے۔ یہ نقاش کا قول حدیث طیبہ میں ہے۔ ''تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی وسعت ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ امام مالک اور دیگر علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کیل کرنے والے کی اجرت بائع پر ہے۔ ابن قاسم اور ابن نافع نے کہا کہ امام مالک نے فرمایا: انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ تو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کیل کرنے والے تھے اسی طرح وزن کرنے والے اور گنتی کرنے والے کی صورتحال ہوگی، کیونکہ جب آدمی کھانے کے سامان میں سے کوئی معلوم پیمانے بیچتا ہے اور اس پر عقد لازم کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ مشتری کے حق کو اپنے حق سے علیحدہ اور جدا کرے، مگر یہ کہ اس میں سے معین کو بیچے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جہاں تک گننے کی اجرت کا تعلق ہے تو وہ بھی بائع پر ہوگی کیونکہ مشتری تو اپنے دراہم دینے والا ہے، دیتے ہوئے کہے گا: یہ صحیح ہے تو آپ نے ان کے ردی ہونے کا دعویٰ کرنا ہے سو خود ان کو دیکھ لو اور یہ وجہ بھی ہے کہ نفع بائع کے لیے ہے تو اجرت بھی اسی پر ہونی چاہیے، اسی طرح جس پر قصاص لازم ہے اس پر گننا لازم نہیں، کیونکہ اس پر خود اپنا ہاتھ کاٹنا تو لازم نہیں بلکہ اس پر تو لازم ہے کہ قصاص لینے والے کے مطالبہ کی صورت میں فدیہ دے اور اس فدیے پر صلح کرے، لہٰذا ہاتھ کاٹنے والے کی اجرت قصاص لینے والے پر ہے جبکہ امام شافعی نے اپنے مشہور قول میں کہا ہے کہ یہ اجرت اس پر ہوگی جس سے قصاص لیا جاتا ہے جس طرح کہ بائع پر ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آدمی کے لیے اپنی دعا میں اللھم تصدق علی کہنا مکروہ ہے، کیونکہ صدقہ اس کی طرف سے ہوتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہ رہا ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو تمام نعمتوں کے ذریعے ثواب عطا فرما کے فضل فرمانے والا ہے اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں۔ حضرت حسن نے ایک آدمی کو اللھم تصدق علیّ کہتے ہوئے سنا، تو فرمایا: اے فلاں! اللہ تعالیٰ صدقہ نہیں کرتا صدقہ تو وہ کرتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ نہیں سنا تو تو یہ کہہ: اللھم أعطنی و تفضل علیّ یا الٰہی! مجھے عطا فرما اور میرے اوپر اپنا فضل فرما۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ

1۔ السنن الکبریٰ، کتاب الشہادت، جلد 10، صفحہ 199	2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 67

لَاَنْتَ یُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ ۫ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ
وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۞ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا
وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ ۞ قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ
الرّٰحِمِیْنَ ۞ اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ وَ اْتُوْنِیْ
بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۞

''آپ نے پوچھا: کیا تمہیں علم ہے جو سلوک تم نے کیا یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ جب تم نادان تھے (سراپا حیرت بن گئے) کہنے لگے: کیا (سچ سچ) آپ ہی یوسف ہیں، فرمایا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ بڑا کرم فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یقیناً جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے (وہ آخر کار کامیاب ہوتا ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ بھائیوں نے کہا: خدا کی قسم! بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر اور بے شک ہم ہی خطا کار تھے۔ آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرمادے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈالوا سے میرے باپ کے چہرے پر وہ بینا ہو جائیں گے اور (جاکر) لے آؤ میرے پاس اپنے سب اہل و عیال کو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ استفہام بمعنی تذکیر و توبیخ ہے، اور یہی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی: لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا (یوسف: 15) میں تجھے ضرور ان کے اس معاملے سے آگاہ کروں گا۔ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب انہوں نے پکڑا تھا اس وقت وہ ابھی چھوٹے تھے اور نبی نہیں تھے، کیونکہ جہالت کی صفت اسی صورت میں بیان کی جاسکتی ہے اور یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اب ان کی حالت بہتر ہے۔ یعنی یہ تم نے اس وقت کیا جب تم چھوٹے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور ان کا قول اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ (اگرچہ ہم غلطی پر تھے) اس بنیاد پر ہے، کیونکہ بڑے ہو گئے مگر اپنے باپ سے شرم محسوس کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے انہوں نے اپنی کاروائی سے اپنے باپ کو آگاہ نہ کیا۔

ایک قول کے مطابق: اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اس کاروائی کے انجام سے ناواقف تھے۔ واللہ اعلم۔

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ جب وہ آپ کے پاس پہنچے اور انہوں نے کہا: مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ تو وہ آپ کے سامنے جھک گئے اور آپ کے سامنے انہوں نے عاجزی اختیار کی تو آپ کا دل ان کے لیے نرم ہو گیا اور آپ نے انہیں اپنا تعارف کرایا۔ فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ تو وہ متنبہ ہوئے اور کہا: اِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مسکرائے تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ سمجھا تو سمجھ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ پھر حضرت یوسف مسکرائے۔ جب آپ

مسکرائے تو گویا آپ کے اوپر والے دانت پروئے ہوئے موتی تھے، تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ جانا تو استفہامیہ انداز میں کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ کے بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا یہاں تک کہ آپ نے تاج اتارا تو آپ کے سر مبارک میں ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت شامہ کی مثل تھی تو جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ پھر اپنا تاج اتارا تو وہ آپ کو پہچان گئے اور انہوں نے کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے آپ کی طرف ایک خط لکھا جس میں آپ نے اپنے بیٹے کا مطالبہ کیا خط میں تھا: یعقوب صفی اللہ ابن اسحاق ذبیح اللہ ابن ابرہیم خلیل اللہ کی طرف سے عزیز مصر کی طرف۔ اما بعد۔ بے شک ہم آزمائش اور امتحان کا گھرانہ ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دادا ابراہیم علیہ السلام کو نمرود اور اس کی آگ کے امتحان میں مبتلا کیا، پھر میرے باپ اسحاق کو ذبح کے ذریعے آزمایا، پھر اس نے مجھے اپنے ایسے بیٹے کے ذریعے آزمایا جو مجھے ساری اولاد سے محبوب تھا یہاں تک کہ رو رو کے میری بینائی چلی گئی بے شک نہ میں نے چوری کی اور نہ ہی کوئی چور میں نے پیدا کیا۔ والسلام۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خط پڑھا تو آپ کے اعضاء کانپنے لگے جلد میں تھرتھراہٹ طاری ہوگئی اور آنکھوں سے رونے کی وجہ سے آنسوں بہنے لگے اور آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تو یہ بھید کھل گیا۔ ابن کثیر نے انك پڑھا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ قراءت بھی بطور استفہام ہو جیسے تلك نعمة کیا یہ نعمت ہے؟ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ یعنی میں مظلوم ہوں اور مراد آپ کا قتل ہے۔ اور آپ نے انا هو يوسف نہ کہا اس واقعہ کی تعظیم کی وجہ سے۔ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا یعنی نجات اور بادشاہ کے ذریعے اللہ نے ہمارے اوپر احسان فرمایا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے، مصائب پر صبر کرتا ہے اور گناہوں سے اجتناب کر کے صبر اختیار کرتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جو اس کی آزمائش میں صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور اس کی اطاعت کو برقرار رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے کہا: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِيْ یا کو ثابت رکھ کے پڑھا ہے یہ قرأت بھی جائز ہے اس صورت میں مَنْ بمعنی الذی ہوگا اور یتقی صلہ میں داخل ہوگا یا ثابت رہے گی اور يَصْبِرْ کو رفع دیا جائے گا۔ اور یصبر کو اس بنیاد پر جزم دینا بھی جائز ہوگا کہ یتقی کو آپ محل جزم میں بنائیں اور من شرطیہ ہو اور یا ثابت رہے۔ اور جزم کی علامت اس ضمہ کے حذف کو بنالیں جو اصل میں یا پر تھا جس طرح شاعر نے کہا ہے:

ثم نادِي إذا دَخلتَ دِمَشْقًا   يا يزيدُ بنَ خالدِ بنِ يزيد

پھر تو جب دمشق میں داخل ہو تو ندا دے اے یزید بن خالد بن یزید اس میں نادی میں ''ی'' ثابت ہے۔

ایک شاعر نے کہا:

ألم يأتيك والأنباءُ تَنْمِي   بما لَاقتْ لَبُونُ بني زيادِ

جماعت کی قرات ظاہر ہے ''انہ'' میں ''ھاء'' گفتگو سے کنایہ اور جملہ اس کی خبر ہے۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا اصل میں دو ہمزہ تھے دوسرے کو مخفف کر دیا گیا اس کو ثابت رکھنا جائز نہیں اسم فاعل مؤثر ہے جبکہ مصدر ایثار ہے۔ کہا

جاتا ہے اثرت استراب اثارۃ فأنا مشیر یہ بھی افعل کا وزن تھا پھر اس میں تعلیل کر دی گئی اصل میں اثیر تھا یا کی حرکت ثا کو دی یا (ماقبل مفتوح) کو الف سے بدلا پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اور اثرت بروزن فعلت ہو گیا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی اور آپ کو علم، بردباری، حکمت، عقل اور بادشاہی کے ذریعے منتخب فرمایا۔ وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ یعنی گناہ کار یہ خطیٔ یخطأ سے مشتق ہے اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی غلطی کر دے۔ اور اس کے ضمن میں معانی کا سوال بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ انہوں نے وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ کیسے کہا حالانکہ انہوں نے تو جان بوجھ کے یہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ انہوں نے جان بوجھ کے ایسا کیا تھا مگر جان بوجھ کر بھی تب ہی کیا تھا کہ راہ حق سے غلطی کر لی تھی، اور اسی طرح ہر وہ آدمی جو گناہ کرتا ہے تو وہ اس راستے سے ہٹ جاتا ہے جو صحیح اور حق کا راستہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شبہ اور گناہ میں پڑ جاتا ہے۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ اور آپ نے بردباری کی انتہا کر دی۔ الْیَوْمَ کا معنی الوقت ہے اور التثریب سے مراد التعییر والتوبیخ ہے یعنی اب نہ تم پر کوئی عار ہے، نہ سختی اور نہ ہی ملامت، یہ سفیان ثوری وغیرہ کا قول ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو وہ اسے حد لگائے ولا یُثَرِّبْ علیہا یعنی اس کو عار نہ دلائے“۔ مبشر نے کہا:

فَعَفَوْتُ عنهم عَفْوَ غَيْرِ مُثَرِّبٍ وتركتهم لعقابِ يومِ سَرْمَدِ

میں نے انہیں ایسا معاف کیا کہ ان پر کوئی عار نہیں اور میں نے انہیں قیامت کے دن کی سزا کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

اصمعی نے کہا: ثَرَّبْتُ علیہ و عَرَّبْتُ علیہ اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے یہ تب کہا جب تو اس کے ساتھ برائی سے پیش آیا۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ جو میرے اور تمہارے درمیان حرمت اور بھائی چارے کے حقوق ہیں ان میں اب کوئی فساد نہیں تمہارے لیے میرے پاس معافی اور درگزر ہے۔ تثریب کی اصل افساد ہے اور یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن دروازے کے دونوں کواڑ پکڑے اور لوگوں نے بیت اللہ کی پناہ لی ہوئی تھی آپ نے فرمایا: ”سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور گروہ کو شکست دی“ (1)۔ پھر فرمایا: ”اے معشر قریش! تمہارا کیا خیال ہے“۔ انہوں نے عرض کی: بھلائی، کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے اگرچہ آپ قدرت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”میں بھی وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے حیا محسوس کرتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تھے تو میں نے ان کو کہا تھا: آج ہم تم سے انتقام لیں گے اور تمہارا بندوبست کریں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو مجھے اپنی بات سے شرم آ رہی تھی۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ اس میں دعا کا معنی ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی پردہ پوشی فرمائے اور ان پر رحم فرمائے۔ اخفش نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمْ پر

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 9، صفحہ 83

وقف کو جائز قرار دیا ہے جبکہ پہلی صورت مستعمل ہے، کیونکہ عَلَيْكُمُ پر وقف اور الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ سے ابتدا کی صورت میں آج ہی مغفرت کے یقین کا اظہار ہے اور یہ تو صرف وحی کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ عطا خراسانی نے کہا: نوجوان سے ضروریات کو طلب کرنا بوڑھے سے طلب کرنے کی نسبت آسان ہے، آپ نہیں دیکھتے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ عنقریب میں تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا، هٰذَا قمیص کی صفت ہے اور قمیص مذکر ہے۔

جہاں تک شاعر کے قول کا تعلق ہے:

تَدْعو هَوَازِنُ والقميصُ مُفَاضَةٌ فوق النِطَاقِ تُشَدُّ بالأزرار

شعر میں القمیص مفاضۃ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قمیص مؤنث ہے۔

اس میں تقدیر عبارت: والقمیص درع مفاضۃ ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ ابن سدی نے اپنے باپ سے عن مجاہد روایت کی: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کہا: اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا اس نے کہا: حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات سے آگاہ کیا گیا تھا کہ ان کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کو لوٹا دے گی، لیکن وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ قمیص تھی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کے ریشم سے آگ میں پہنائی تھی، آپ نے حضرت اسحاق کو پہنائی، حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنائی اور حضرت یعقوب علیہ اسلام نے وہ قمیص چاندی کے ایک ٹکڑے میں ڈال کر حضرت یوسف علیہ السلام کی گردن میں لٹکا دی اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے نظر کا خوف رہتا تھا۔ جبریل امین نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خبر دی کہ اپنی قمیص بھیجو اس میں جنت کی خوشبو ہے اور جنت کی خوشبو کسی بیمار یا مصیبت میں مبتلا آدمی پر پڑے تو اس کو شفا مل جاتی ہے۔ حسن نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے متعلق نہ بتایا ہوتا تو آپ کو پتہ نہ چلتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی انہیں واپس مل جائے گی۔ اور جس نے قمیص اٹھائی تھی وہ یہوذا تھا، اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: میں نے ہی آپ کی قمیص کو جھوٹا خون لگا کر ان تک پہنچائی تھی اور ان کو پریشان کیا تھا اور میں ہی اب اسے اٹھاؤں گا تاکہ ان کو خوش کروں اور ان کی بینائی ان تک واپس لوٹے، سوا ای نے قمیص اٹھائی، سدی نے اسے بیان کیا ہے۔ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ تاکہ مصر کو اپنا گھر بنالیں۔ مسروق نے کہا: ان کے مردوں اور عورتوں کی تعداد ترانوے تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ قمیص وہ تھی جس کو پیچھے سے پھاڑا گیا تھا تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چل جائے کہ آپ زنا سے محفوظ رہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوعاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے واللہ اعلم

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝ فَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰي وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ

بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۹۶ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا
اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۝۹۷ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۹۸ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ؕ ۝۹۹

''اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے باپ نے فرمایا کہ میں تو یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اگر تم مجھے بے وقوف خیال نہ کرو۔ گھر والوں نے کہا: بخدا! (باباجی) آپ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ پس جب آ پہنچا خوشخبری سنانے والا (اور) اس نے ڈالا وہ پیراہن آپ کے چہرے پر تو وہ فوراً بینا ہو گئے آپ نے (فرط مسرت سے) کہا: (دیکھو) کیا میں نہیں کہا کرتا تھا تمہیں کہ میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ (کے جتانے) سے جو تم نہیں جانتے۔ بیٹوں نے عرض کی: اے ہمارے پدر! (محترم) مغفرت مانگیے ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی، بے شک ہم ہی قصوروار تھے۔ فرمایا: عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لیے اپنے رب سے، بے شک وہی غفور رحیم ہے۔ پھر جب وہ سب یوسف کے روبرو ہوئے آپ نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو اور (انہیں) کہا: داخل ہو جاؤ مصر میں، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم خیر و عافیت سے رہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ یعنی جب قافلہ مصر سے شام کی طرف نکلا، کہا جاتا ہے: فصل فصولا، وفصلته فصلا، یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قَالَ اَبُوْهُمْ یعنی آپ نے قریبیوں میں سے جو آپ کے پاس تھا اور مصر نہیں گیا تھا اسے کہا اور وہ آپ کے پوتے تھے اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے کچھ بیٹے گئے ہوں اور باقیوں کو آپ نے فرمایا ہو: اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہوا چلی اور وہ حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو آپ تک اٹھا لائی حالانکہ دونوں کے درمیان آٹھ راتوں کی مسافت تھی (1)۔ حضرت حسن نے کہا: دس راتوں کی مسافت تھی۔ انہیں سے ایک ماہ کی مسافت بھی مروی ہے۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: پیراہن کی خشبو تخت بلقیس کی طرح پہنچی کہ وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ مجاہد نے کہا: ہوا چلی اس نے پیراہن کو الٹ پلٹ کیا تو دنیا میں جنت کی خوشبوئیں پہنچ گئیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گئیں، آپ نے جنت کی خوشبو پائی تو آپ کو پتہ چل گیا کہ دنیا میں جنت کی خوشبو صرف اسی پیراہن کی وجہ سے ہو سکتی ہے، تو اس وقت آپ نے فرمایا: اِنِّيْ لَاَجِدُ یعنی میں سونگھ رہا ہوں۔ تو وہ سونگھنے کی حس کی وجہ سے پائی گئی۔ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اگر تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو (2)۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے:

إلاّ سليمان إذ قال المليكُ لَهٗ قُمْ فِي البَرِيَّةِ فَاحْدُدْهَا عَنِ الفَنَدِ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 71 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

عن الفند یعنی عن السفه، حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: لولا أن تکذبون یعنی اگر تم مجھے نہ جھٹلاؤ۔ الفند سے مراد الکذب ہے۔ قد أفند إفنادا یعنی اس نے جھٹلایا۔ اسی سے شاعر کا شعر ہے:

هل فی افتخار الکریم من أَوَدِ   أم هَلْ لقول الصَّدُوقِ من فَنَدِ

یعنی من کذب ایک قول کے مطابق: لولا أن تقبحون ہے یہ ابوعمرو کا قول ہے۔

التنفید سے مراد التقبیح ہے، شاعر نے کہا:

یا صاحبیّ دعا لومی و تَفْنِیدِی   فلیس مافاتَ مِن أمری بمردودِ(1)

ابن الاعرابی نے کہا: لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ یعنی اگر تم میری رائے کو کمزور نہ سمجھو تو یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ الفند سے مراد بڑھاپے کی وجہ سے رائے کا کمزور ہونا ہے۔ چوتھا قول تضللون تم مجھے گمراہ نہ خیال کرو تو یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: تلومون، یعنی تم مجھے ملامت نہ کرو۔ التفنید سے مراد ملامت اور رائے کا ضعف ہے۔ حضرت، حسن حضرت قتادہ اور مجاہد نے بھی کہا: تهرمون یعنی تم مجھے بوڑھا نہ سمجھو(2)۔ یہ تمام کے تمام اقوال قریب المعنی ہیں، یہ عاجزی اور رائے کے ضعف کی طرف راجع ہے، جب کوئی چیز کسی کو عاجز کردے تو کہا جاتا ہے: فندہ تفنیدا جس طرح کسی نے کہا:

أهلکنی باللوم و التفنید

اس نے مجھے ملامت اور عاجز کر کے ہلاک کر دیا۔

جب کوئی غلط کلام کرے تو کہا جاتا ہے: أفند، الفند سے مراد کلام اور رائے میں خطا ہے، جس طرح نابغہ نے کہا:

فاحددها عن الفَنَدِ

یعنی عقل میں فساد بپا کرنے سے تو اسے روک۔ اور اسی سے کہا گیا ہے کہ ملامت تفنید ہے، شاعر نے کہا:

یا عاذلیّ دَعَا المَلَامَ وأَقْصِرَا   طالَ الهَوَی و أطلتما التَّفْنِیدَا(3)

اور أفند فلانًا الدهر کہا جاتا ہے جب وہ اسے خراب کردے۔ اسی سے مقبل کا قول ہے:

دَعِ الدَّهْرَ یَفْعَلُ مَا أَرَادَ فإنَّهُ   إذا کُلِّفَ الإفنادَ بالنَّاسِ أَفْنَدَا(4)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ یعنی صحیح رستے سے چلے جانے میں۔

حضرت ابن عباس اور ابن زید نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں سے آپ اپنی ماضی کی غلطی میں ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ اپنے پرانے جنون میں ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: یہ نافرمانی ہے۔ حضرت قتادہ اور سفیان نے کہا: آپ اپنی پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ان کے نزدیک حضرت یوسف فوت ہو چکے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اولاد میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا جبکہ ان کو کوئی خبر نہ تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے: آپ کے اہل اور قرابت داروں میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا تھا۔ ایک قول کے مطابق پوتوں نے کہا اور وہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 73   2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 75   3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 76   4۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

چھوٹے تھے۔ واللہ اعلم۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ، عَلٰى وَجْهِهٖ سے مراد علی عینیه ہے یعنی آپ کی دونوں آنکھوں پر فَارْتَدَّ بَصِیْرًا، اَنْ زائدہ ہے، اور بشیر سے مراد شمعون یا یہوذا ہے۔ یہوذا نے کہا: آج میں پیراہن لے کر جاؤں گا جس طرح کہ خون سے لت پت قمیص لے کے گیا تھا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سدی سے مروی ہے کہ اس نے بھائیوں کو کہا: تم جانتے ہو کہ پریشانی والی قمیص میں لے کے گیا تھا سو مجھے جانے دو تاکہ خوشی والی قمیص بھی میں لے کر جاؤں۔ یحییٰ بن یمان نے حضرت سفیان سے روایت کرتے ہوئے کہا: جب خوشخبری سنانے والا حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: تو نے یوسف کو کس دین پر چھوڑا ہے؟ اس نے کہا: اسلام پر۔ آپ نے فرمایا: اب نعمت مکمل ہوگئی۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خوشخبری لانے والا آیا تو آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ذریعے آپ اسے بدلہ دیتے تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور سات راتوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا، لیکن (اس کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے تیرے اوپر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ دعا سارے انعامات سے بڑی ہے اور سب تحائف اور ذخائر سے زیادہ فضیلت والی ہے اور یہ آیت کریمہ خوشخبری کے وقت کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے جواز پر دلیل ہے۔ باب میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے جس میں یہ بھی ہے: ''جب وہ آدمی میرے پاس آیا جس کی خوشخبری دیتے ہوئے میں نے آواز سنی تو میں نے اپنے کپڑے اتارے اور اس کی خوشخبری کے بدلے اسے وہ پہنا دیئے''۔ اس کے بعد انہوں نے پوری حدیث ذکر کی ہے، اور یہ پوری حدیث ان تین آدمیوں کے واقعے کے بیان میں گزر چکی ہے جو پیچھے رہ گئے تھے اور حضرت کعب کا خوشخبری سنانے والے کو اپنے کپڑے دے دینا باوجود اس کے کہ ایسا کرنے کے جواز پر کوئی اور دلیل بھی نہیں تھی کہ جب آدمی کو کسی کے ذریعے خوشخبری کے حصول کی امید ہو (تو کیا وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں)، تو یہ غم اور مصیبت کے زوال کے بعد خوشی کے اظہار کے جواز کی دلیل ہے۔ اس باب سے بچوں کے قرآن مقدس سیکھنے کی وجہ سے خوشی کے اظہار کا جواز اور اس سبب سے لوگوں کو کھانا کھلانے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ ''البقرہ'' کے حفظ کے بعد اونٹ ذبح کیا تھا۔ واللہ اعلم

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ انہیں اپنا ارشاد: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یاد کروایا۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِیْنَ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت: فلما رجعوا من مصر قالوا یا أبانا ہے یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے آپ کو کہا تھا: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ وہ آپ کے پوتے تھے یا آپ کے قریبی رشتہ دار تھے آپ کا بیٹا نہیں تھا، کیونکہ وہ تو غائب تھے۔ اور انہوں نے آپ سے مغفرت کا سوال اس لیے کیا کہ انہوں نے آپ کو پریشان کیا جس کا گناہ سوائے آپ کی معافی کے ساقط نہیں ہو سکتا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ حکم اس آدمی کے لیے بھی ثابت ہوگا جس نے کسی مسلمان کی جان، مال یا اس کے علاوہ کسی چیز

میں زیادتی کی ہو، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے معافی مانگے اور اسے ظلم اور اس کی مقدار کے متعلق بتائے، کیا مطلق معافی مانگنا اسے نفع دے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ نفع بخش نہیں، کیونکہ اگر اس نے اسے زیادتی کے بارے میں آگاہ کیا جس کی ایک خاص حد اور نقصان تھا تو بعض اوقات مظلوم کا دل اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

صحیح بخاری میں (1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے کسی بھائی کی عزت یا کسی چیز میں زیادتی کی ہوئی ہو تو اسے چاہیے کہ آج اس سے معافی مانگ لے قبل اس کے کہ دراہم و دینار نہیں ہوں گے اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوا تو اس کی زیادتی کی مقدار اس کے نیک عمل سے لیا جائے گا اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ اس سے لے کر ظالم کو دے دیئے جائیں گے۔'' مہلب نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے: اخذ منه بقدر مظلمة ارشاد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زیادتی کی مقدار معلوم ہونی چاہیے اور واضح طور پر اس کی طرف اشارہ ہونا چاہیے واللہ اعلم۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے اپنی دعا کو سحری تک موخر فرمایا۔ مثنی بن صباح نے طاؤس سے روایت کرتے ہوئے کہا: جمعہ کی رات کی سحری تھی، اور یہ عاشوراء کی رات تھی۔ ترمذی کی کتاب میں حافظہ کی دعا کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اتنے میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ قرآن میرے سینے میں خلط ملط ہو گیا اور میں اس پر قابو نہ پا سکا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھادوں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تجھے بھی فائدہ دے گا اور جس کو تو وہ سکھائے گا اسے بھی فائدہ دے گا اور جو کچھ تو حاصل کرے گا اسے تیرے سینے میں ثابت کر دے گا'' (2)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وہ کلمات سکھائے، آپ نے فرمایا: ''جب جمعہ کی رات ہو تو ہو سکے تو رات کے آخری ثلث میں اٹھ وہ ساعت مشہودہ ہے اور اس میں کی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے، میرے بھائی یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کہا تھا۔ **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** وہ کہہ رہے تھے یہاں تک کہ جمعہ کی رات آئی'' حضرت ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** یعنی عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا ایام بیض کی راتوں میں یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں کی رات میں کیونکہ ان راتوں میں دعا قبول ہوتی ہے۔ عامر شعبی سے مروی ہے انہوں نے کہا: **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** سے مراد یہ ہے کہ میں یوسف کو کہوں گا اگر اس نے تمہیں معاف کر دیا تو میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا: سعید بن داؤد نے اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حدثنا ھشیم قال حدثنا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، القصاص یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 967

ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی شأن الحساب والقصاص، حدیث نمبر 2343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، حفظ الدعاء، جلد 2، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبد الرحمن بن اسحق عن محارب بن دثار عن عمہ انہوں نے کہا کہ میں سحری کے وقت مسجد میں آتا تھا تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرتا تو انہیں یہ کہتے ہوئے سنتا تھا: اے اللہ! تو نے حکم دیا تو میں نے اطاعت کی، تو نے دعوت دی تو میں نے اسے قبول کیا، اور یہ سحری کا وقت ہے مجھے معاف فرمادے، تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ملا اور کہا: کچھ ایسے کلمات ہیں جو میں آپ سے سنتا ہوں آپ سحری کے وقت کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی توسَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ کے قول کے ذریعے اپنے بیٹوں کو سحری تک مؤخر کیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ یعنی اس محل میں داخل ہوئے جو آپ کا تھا۔ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوشخبری سنانے والے کے ساتھ دو سو سواریاں اور زادراہ بھیجا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گزارش کی کہ وہ اپنے اہل خانہ اور سب بیٹوں کو ساتھ لائیں۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ یعنی اپنے پاس بلایا اور اَبَوَيْهِ سے مراد آپ کا باپ اور خالہ ہے کیونکہ آپ کی ماں تو بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال فرما گئیں تھیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر آپ کی ماں کو زندہ کیا تا کہ وہ آپ کو سجدہ کرے اور آپ کا خواب ثابت ہو جائے، یہ حضرت حسن کا قول ہے اور سورۂ ''بقرہ'' میں یہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لائے۔

ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ابن جریج نے کہا: یعنی سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ان شاء اللہ ہے(1) انہوں نے کہا: یہ قرآن کی تقدیم و تاخیر ہے؛ (یعنی اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کے الفاظ پہلی آیت کے ساتھ ہیں) نحاس نے کہا: ابن جریج کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ مصر میں داخل ہو چکے تھے تو انہیں آپ نے ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کیسے کہا؟ یہ قول بھی ہے کہ آپ نے اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تبرکاً کہا۔ اٰمِنِيْنَ یعنی قحط سے امن میں یا فرعون سے امن میں، کیونکہ وہ فرعون کی اجازت کے بغیر مصر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

''اور (جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے اور یہ (منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا: اے میرے پدر بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا ہے اور اس نے بڑا کرم فرمایا مجھ پر جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے اور لے آیا تمہیں صحرا سے اس کے بعد کہ ناچاقی ڈال دی تھی شیطان نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 81

میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان، بے شک میرا رب لطف و کرم فرمانے والا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ حضرت قتادہ نے کہا: عرش سے مراد چار پائی ہے۔ اس کے محامل پہلے گزر چکے ہیں اور بعض اوقات بادشاہی اور خود بادشاہ کو عرش کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے اسی سے نابغہ ذبیانی کا قول ہے:

عُرُوشٌ تَفَانَوْا بعد عِزٍّ و أَمْنَةٍ

پہلے گزر چکا ہے۔

وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا میں لَهٗ کی ضمیر کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے؛ معنی یہ ہوگا: اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ سجدے میں گر گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے خواب کے ثبوت کے لیے قبلہ کی طرح تھے، یہ حضرت حسن سے مروی ہے، جبکہ نقاش نے کہا: یہ غلطی ہے (صحیح بات یہ ہے کہ) ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے کیونکہ سورت کے آغاز میں رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ہے اور ان کا سلام یہ تھا کہ ادنیٰ، اعلیٰ کو اور چھوٹا بڑے کو سجدہ کرے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، آپ کی خالہ اور بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہوئی اور آپ نے کہا: هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان ایک سو بیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی اور عبداللہ بن شداد نے کہا: چالیس سال کا عرصہ تھا(1)۔ سدی، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: چھتیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت حسن، جسر بن فرقد اور فضیل بن عیاض نے کہا: اسی سال حضرت وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کنویں میں پھینکا گیا تو آپ کی عمر سترہ سال تھی اور اسی سال آپ اپنے باپ سے غائب رہے اور اپنے باپ کی ملاقات کے بعد تیئیس سال تک زندہ رہے اور وصال کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی جبکہ تورات میں ایک سو چھبیس سال مرقوم ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد افراثیم، منشاء اور رحمت حضرت ایوب علیہ اسلام کی بیوی ہے، جبکہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیس سال رہے اور پھر آپ کا وصال ہو گیا۔ ایک قول کے مطابق: اٹھارہ سال رہے۔ بعض محدثین نے کہا: چالیس سال اور کچھ عرصہ رہے۔ اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے درمیان تینتیس سال کا عرصہ تھا پھر اللہ نے ان کو ملا دیا۔ ابن اسحاق نے کہا: اٹھارہ سال کا عرصہ تھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت قتادہ عن حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا میں یہ نہیں تھا کہ انہوں نے سجدہ کیا ہو بلکہ ان کا ایک طریقہ تھا کہ وہ اپنے سروں سے اشارہ کرتے تھے، یہی ان کا سلام ہوتا تھا۔ ثوری، ضحاک

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 85

اور دیگر لوگوں نے کہا کہ وہ اسی طرح کا سجدہ تھا جس طرح ہمارے ہاں ہوتا ہے اور یہی ان کا سلام تھا۔ ایک قول کے مطابق وہ رکوع کی طرح جھکنا تھا اور خرو علی الارض نہیں تھا اور اسی طرح جھک کر اور اشارہ کر کے ان کے سلام کا طریقہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سارے عمل کو ہماری شریعت میں منسوخ فرما دیا اور جھکنے کے بدلے کلام کو ہمارا سلام بنا دیا۔ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ سجدہ جس بھی طریقے سے تھا صرف سلام کے طور پر تھا سجدہ عبادت نہیں تھا۔ قتادہ نے کہا: ان کے نزدیک بادشاہوں کا یہی سلام ہوتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اہل جنت کا سلام السلام علیکم عطا فرمایا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ جھکنا اور اشارہ کرنا جس کو منسوخ کر دیا گیا ہے یہ مصر کے علاقوں میں عجمیوں میں عادت بن چکا ہے، اسی طرح لوگوں کا کسی کے لیے کھڑا ہونا حتی کہ اگر وہ کھڑا نہ ہو تو آنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے دل میں اس کی کوئی قدر نہیں، اسی طرح جب وہ ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے جھکنا ان کی مستقل عادت اور مستقل وراثت ہے، بالخصوص امراء اور سرداروں سے ملاقات کے وقت۔ ان لوگوں نے ان لوگوں کے طریقے کو اپنا لیا اور سنن سے اعراض کر لیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم ایک دوست کو ملیں تو کیا ایک دوسرے کے لیے جھکیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ ہم نے عرض کیا: کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ معانقہ کریں! آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ ہم نے کہا: کیا ہم مصافحہ کریں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ اس روایت کو ابو عمر نے التمہید میں روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ''تم اپنے سردار اور اپنے سے بہتر آدمی کے لیے کھڑے ہو جاؤ'' (1)۔ مراد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ ان مخصوص حالات کی بنیاد پر حضرت سعد کے ساتھ ہی خاص ہوگا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا قیام اس لیے تھا تاکہ وہ آپ کو گدھے سے اتاریں اور یہ بڑی عمر کے آدمی کے لیے جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنے لگے اور اگر وہ اس عمل کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنے لیے اس کو لطف اور راحت محسوس کرے تو علماء نے اسے بھی جائز قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس کو اس بات نے خوش کیا کہ لوگ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کریں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ٹھکانہ جہنم میں بنا لے''۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر کوئی بھی زیادہ عزت والا نہ تھا اس کے باوجود وہ اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے آپ کو دیکھ کر آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر یہ کہا جائے کہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ تو اسے کہا جائے گا: یہ اس صورت میں جائز ہے جب بندہ آپ سے دور ہو، تاکہ آپ سلام کے وقت اس کی تعیین کر دیں، اور اگر وہ قریب ہو تو پھر جائز نہیں جبکہ ایک قول قرب و بعد کی دونوں صورتوں میں منع کا ہے اس کا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''جس نے کسی اور کی مشابہت اختیار کی تو وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ اور آپ نے فرمایا: ''یہود و نصاریٰ کی طرح سلام نہ کرو، پس یہود کا سلام

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 95

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 100۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4552۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہتھیلی کے ذریعے اور نصاریٰ کا سلام اشارہ کے ساتھ ہے"(1)۔ اور جب کوئی سلام کرے تو وہ نہ جھکے اور نہ ہی سلام کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چومے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جھکنا تواضع پر دلالت کرتا ہے اور تواضع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اور جہاں تک ہاتھوں کو بوسہ دینے کا تعلق ہے تو یہ عجمیوں کا عمل ہے اور ان کے ایسے افعال کی اتباع نہیں کی جائے گی جو انہوں نے اپنے بڑوں کی تعظیم کے لیے خود بنا لیے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میرے سر کے پاس اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو جس طرح عجمی اپنے سے برتر لوگوں کے سر کے پاس کھڑے ہوتے ہیں"۔ تو یہ عمل اسی کے مثل ہے البتہ مصافحہ میں کوئی حرج نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ سے واپسی کے موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کا حکم بھی ارشاد فرمایا اور فرمایا: "باہم مصافحہ کیا کرو یہ کھوٹ کو دور کرتا ہے"(2)۔ غالب تمار نے حضرت شعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے تھے اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کرتے تھے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام مالک نے تو مصافحہ کو بھی ناپسند کیا ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے مصافحہ اور معانقہ کو ناپسند کیا ہے، سحنون اور دیگر اصحاب مالک نے یہی موقف اختیار کیا ہے تاہم امام مالک سے اس کے برعکس جواز مصافحہ کے حوالے سے بھی روایت موجود ہے۔ مؤطا کی روایت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اور سلف وخلف میں سے علماء کی ایک جماعت جواز مصافحہ کی قائل ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے صرف اس وجہ سے مصافحہ کو ناپسند کیا ہے کہ آپ نے اسے دین کا کوئی معاملہ خیال نہیں کیا اور نہ ہی یہ سلام کی طرح منقول ہے، اگر یہ سلام کا حصہ ہوتا تو ذکر کے اعتبار سے بھی اس کے برابر ہوتا۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصافحہ کے حوالے سے تو ایک حدیث بھی ہے جس میں اس کے بارے میں ترغیب ہے اور جو اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی محافظت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آپ نے فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے عرض کیا: یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو یہ گمان کرتا تھا کہ مصافحہ عجمیوں کا (طریقہ) ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہم ان سے زیادہ مصافحہ کے حقدار ہیں جب بھی دو مسلمان ایک دوسرے کو ملتے ہیں اور باہم محبت اور اخلاص کی بنیاد پر ان میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتا ہے تو ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے"(3)۔

قولہ تعالیٰ: وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ۔ من الجب نہیں فرمایا یہ مہربانی اور کرم نوازی کے طور پر ہے تاکہ آپ اپنے بھائیوں کو تثریب علیکم کے قول کے ساتھ معاف کرنے کے بعد ان کی کارائی یاد نہ دلا دیں۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہی صوفیاء کرام کے نزدیک اصل ہے کہ صفا کے وقت جفا کو ذکر کرنا بھی جفا ہے، صوفیاء کا یہ قول صحیح ہے جس پر کتاب اللہ بھی دال ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ آپ کے قید میں جانے میں خود اپنا اختیار تھا کہ آپ نے خود کہا تھا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ (یوسف: 33) جبکہ کنویں میں جانا اللہ تعالیٰ کے ارادے سے تھا۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ قید خانے میں آپ چوروں اور نافرمان لوگوں کے ساتھ تھے جبکہ کنویں میں اللہ تعالیٰ

1۔ کنز العمال، جلد 9، صفحہ 118 2۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 130 3۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 134

کے ساتھ، تو اسی طرح قید خانے سے نجات دینے میں احسان بھی بہت بڑا تھا اور چونکہ قید خانہ میں آپ ایسے معاملے کی وجہ سے گئے جس کا آپ نے ارادہ کیا تھا اور اسی طرح اپنے اختیار سے گئے جب آپ نے خود کہہ دیا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ تو اس میں مصیبت اور کرب بھی زیادہ تھا۔ اور اس میں آپ نے یہ بھی کہا تھا: عِنْدَ رَبِّكَ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو اس پر آپ کا عتاب ہوا۔ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا مسکن کنعان کی سرزمین تھی، اور اہل کنعان مویشیوں والے اور صحرائی لوگ تھے۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام صحراء کی طرف نکل گئے اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ میں سے کسی کو نبی مبعوث نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ بدا مقام کی طرف چلے گئے شاعر نے بھی اس شعر میں بدا سے مراد وہ مقام لیا ہے۔

وأنتِ التی حَبَّبتِ شَغْبًا إلی بَدَا إلیّ وأوطانی بلادٌ سِوَاهُمَا

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہاڑ کے نیچے اس جگہ پر ایک مسجد تھی۔ بَدَا کہا جاتا ہے جب وہ لوگ بدا آئیں جس طرح غَارَ دا غور آ کہا جاتا ہے یعنی جب وہ غور کے مقام پر آئے۔ معنی یہ ہو گا کہ وہ تمہیں بدا کے مقام سے لے آئے گا، اس کو امام قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے ضحاک عن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے بیان کیا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ یعنی حسد کو پیدا کر کے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔ ایک قول کے مطابق نَزَغَ کا معنی ہے افسد یعنی اس نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد بپا کیا۔ آپ کا ان کے گناہ کو شیطان پر ڈال دینا آپ کی طرف سے بطور مہربانی تھا۔ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ یعنی وہ اپنے بندوں کے لیے نرم ہے۔ خطابی نے کہا: لطیف سے مراد وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر لطف و کرم فرماتی ہے اور اس کا لطف و کرم ایسے طریقے سے ہوتا ہے جن کو بندے جانتے بھی نہیں ہوتے اور وہ ان کے لیے ایسے اسباب مہیا فرما دیتا ہے جو ان کے گمان میں بھی نہیں ہوتے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ (الشوریٰ:19) ایک قول کے مطابق لطیف سے مراد معاملات کے دقائق کو جاننے والا ہے۔ یہاں اس سے مراد اکرام اور نرمی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکال کر ان کے خاندان کو صحراء سے وہاں پہنچا کر اور آپ کے دل سے شیطانی وسوسے کو نکال کر لطف و کرم فرمایا(1)۔

روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل اور بچوں کے ساتھ آئے اور مصر کی سرزمین کو شرف بخشا تو جب اس کی اطلاع حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچی تو آپ نے فرعون مصر سے اجازت مانگی جس کا نام ریان تھا کہ وہ آپ کو اپنے باپ یعقوب کو ملنے کی اجازت دے اور اسے آپ کے آنے کی خبر دی تو اس نے آپ کو اجازت دے دی اور اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا حکم دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور بادشاہ نکلے تو آپ کے ساتھ چار ہزار افراد تھے اور ہر امیر کے ساتھ اللہ کی اتنی مخلوق تھی جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اہل مصر بھی ان کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملنے کے لیے سوار ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام یہوذا کے ہاتھ پر ٹیک لگا کر چل رہے تھے۔ حضرت یعقوب

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 88

علیہ السلام نے گھوڑے، لوگ اور لشکر کو دیکھا تو فرمایا: اے یہوذا! یہ فرعون مصر ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ یہ آپ کا بیٹا یوسف ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے سلام میں پہل کرنا چاہا تو آپ کو اس سے روک دیا گیا کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام آپ سے زیادہ اس کے حقدار تھے اور افضل بھی تھے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے سلام کا آغاز فرمایا اور فرمایا: تم پر سلام ہو اے غموں کو دور کرنے والے! اور رو پڑے تو حضرت یوسف علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ رو پڑے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام خوشی سے روئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد گرامی کی پریشانی کو دیکھ کر روئے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ رونا چار طرح سے ہوتا ہے، خوف سے رونا، تکلیف سے رونا، خوشی سے رونا اور دکھلاوے کا رونا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے غموں اور پریشانیوں کے بعد میری آنکھ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے گھرانے کے بیاسی آدمیوں کے ساتھ آپ مصر میں داخل ہوئے اور پھر وہ لوگ مصر سے تب نکلے جب ان کی تعداد چھ لاکھ اور کچھ ہزار ہوگئی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دریا کو عبور کیا، اس بات کو عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں ملا کر وہ کل ترانوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔ ربیع بن خثیم نے کہا: جب داخل ہوئے تو ان کی تعداد بہتر ہزار تھی اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو چھ لاکھ تھے۔ حضرت وہب نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹے مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں اور بچے ملا کر نوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون سے بھاگ کر نکلے تو چھ لاکھ پانچ سو ستر اور کچھ مجاہدین تھے۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں چوبیس سال بڑی خوشحالی اور نعمت کی حالت میں مقیم رہے، مصر میں ہی آپ نے وصال فرمایا اور اپنے بیٹے یوسف کے نام وصیت لکھی کہ ان کے جسد اقدس کو یہاں سے اٹھا کر شام میں اپنے باپ حضرت اسحٰق کے پہلو میں دفن کیا جائے تو آپ نے ایسا ہی کیا، اور پھر مصر واپس لوٹ آئے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام کو ساج کے بنے ہوئے تابوت میں بیت المقدس منتقل کیا گیا۔ اسی دن عیصو فوت ہوا، تو دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا، اسی وجہ سے یہودی اپنے مردوں کو بیت المقدس لے جاتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور عیصو اکٹھے پیدا ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن ہوئے دونوں کی عمر ایک سو چوہتر سال تھی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝

”اے میرے رب! عطا فرمایا تو نے مجھے یہ ملک نیز تو نے سکھایا مجھے باتوں کے انجام کا علم، اے بنانے والے آسمانوں اور زمین کے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں مجھے وفات دے در آنحالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ“۔

قولہ تعالیٰ: رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ قتادہ نے کہا: کسی نبی یا غیر نبی (1) نے موت کی تمنا نہیں کی سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے، اور وہ بھی تب جب آپ پر نعمتیں تمام ہو گئیں اور تمام معاملات مکمل ہو گئے تو آپ اپنے پروردگار کی ملاقات کے مشتاق ہو گئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی تمنا نہیں کی بلکہ اسلام پر وفات کی تمنا کی ہے، یعنی جب میری موت آئے تو مجھے حالت اسلام میں موت دے، یہ جمہور کا قول ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: موت کی تمنا صرف تین آدمی کرتے ہیں، ایسا آدمی جو موت سے بعد کے معاملات سے نا واقف ہوتا ہے یا وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مشتاق اور محب ہوتا ہے۔ صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے جو اس پر نازل ہوئی ہے اگر تمنا کرنا ضروری ہی ہو تو اسے یہ کہنا چاہیے۔ یا اللہ! جب تک زندگی تو میرے لیے بہتر جانتا ہے مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے موت دے دے''۔ اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے اور اس کے آنے سے پہلے اسے کوئی نہ بلائے، جب تم میں سے کوئی مرے گا تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہو جائے گا اور مومن کی عمر اس میں بھلائی اور خیر کا اضافہ کرتی ہے''۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت، دنیا سے جانے اور عمل کے خاتمے کی تمنا کی؟ یہ بعید از قیاس بات ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کی شریعت میں یہ جائز ہو، کیا فتنوں کے ظہور اور غلبہ کے وقت اور دین کے ضائع ہو جانے کے خوف کے وقت موت کی تمنا اور دعا جائز نہیں جس طرح کہ ہم (قرطبی) نے کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے۔ اللہ کے ارشاد: مِنَ الْمُلْكِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ مصر کی بادشاہی کل بادشاہی نہیں ہے اسی طرح علم تعبیر بھی کل علم نہیں ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنْ جنس کے لیے ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاجتنبوا الرجس من یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، یعنی آتیتنی الملك وعلمتنی تاویل الاحادیث۔

قولہ تعالیٰ: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ندا کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور وہ ہے رب یہ ندا مضاف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: یا رب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ندا ثانی ہو اور فاطر سے مراد خالق ہے، فهو سبحانه فاطر الموجودات یعنی موجودات کا خالق، ان کا آغاز کرنے والا، ان کی نشو و نما کرنے والا اور بغیر کسی چیز اور نمونے کے ان کو ایجاد فرمانے والا اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں بدیع السموات والارض کے ارشاد گرامی کے تحت تفصیل سے گزر چکی ہے اور ہم (قرطبی) نے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں اس پر مزید اضافہ کیا ہے۔ اَنْتَ وَلِيّٖ یعنی تو میرا مددگار اور دنیا و آخرت میں میرے معاملات کا والی ہے۔ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ صالحین سے مراد آپ کے تین آباء ہیں یعنی حضرت

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 89

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، کراھۃ تمنی الموت، جلد 2، صفحہ 342 3۔ ایضاً

ابراہیم، حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں حالت طہارت و پاکیزگی میں وفات نصیب فرمائی اور سنگ مرمر کے صندوق میں دریائے نیل میں آپ کی تدفین ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ جب آپ کا وصال ہوا تو لوگ جمع ہو گئے، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کے محلے میں آپ کی تدفین ہو تو اس محلے میں برکت کا نزول ہو۔ تمام لوگ اس معاملے پر بضد ہو گئے حتیٰ کے قتال کی نوبت آ گئی، تو پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو دریائے نیل میں ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں سے پورے مصر میں پانی جاتا ہے۔ آپ کی قبر پر سے پانی گزرے گا پھر پورے مصر میں وہ پانی منتشر ہو جائے گا، (تو سب کو برکت حاصل ہوگی) تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو انہوں نے آپ کو دریائے نیل سے نکالا اور چار سو سال کے بعد آپ کا تابوت بیت المقدس منتقل کیا گیا اور آپ کو ایک دعا، وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی وجہ سے اپنے آباء کے ساتھ دفن کیا گیا۔ آپ کی عمر ایک سو سات سال تھی، حضرت حسن سے روایت ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو سترہ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالا گیا اور غلامی، قید خانے اور بادشاہت میں اسی سال گزارے پھر آپ کے بکھرے ہوئے کاموں کو جمع کیا گیا اس کے بعد آپ نے تیئس سال زندگی گزاری (اس طرح کل عمر ایک سو بیس سال ہوئی)۔ آپ کی اولاد میں ابن لہیعہ کے قول کے مطابق افرائیم، منشا اور رحمت ہیں جو کہ حضرت ایوب کی زوجہ تھیں۔

امام زہری نے کہا: افرائیم بن یوسف کا بیٹا نون بن افرائیم تھا اور نون کا بیٹا حضرت یوشع بن نون تھا اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آپ کے معاون تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں نبی بنایا، تو ان کے بعد آپ نبی تھے۔ اور یہ وہی ہیں جنھوں نے اریحا کو فتح کیا اور اس میں جابر لوگوں میں سے جو تھا اسے قتل کیا اور جس طرح سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ سورج نے آپ کی خاطر رکنا چاہا۔ منشا بن یوسف کا بیٹا موسیٰ بن منشا تھا موسیٰ بن عمران سے پہلے۔ اہل تورات کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ ہیں جنھوں نے ایک عالم سے ملاقات کی خواہش کی تھی تاکہ اس سے علم حاصل کریں یہاں تک آپ نے اسے پالیا۔ اور عالم وہ تھا جس نے کشتی کو توڑا، بچے کو قتل کیا اور دیوار بنائی۔ اور موسیٰ بن منشا آپ کے ساتھ رہے یہاں تک کہ یہ آپ کے ساتھ وہاں تک پہنچے جہاں تک آپ پہنچے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس بات کا انکار کرتے ہیں اور صحیح بھی وہ بات ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی اسی طرح قرآن میں بھی ہے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کئی قومیں اور زمانے تھے ان کے درمیان حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"(اے حبیب) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کرتے ہیں آپ کی طرف اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر درآنحالیکہ مکر کر رہے تھے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ، خواہ آپ کتنا

ہی چاہیں ایمان لانے والے اور نہیں طلب کرتے آپ ان سے اس (درس ہدایت) پر کچھ معاوضہ، نہیں ہے یہ
مگر نصیحت سب جہانوں کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ مبتدا اور خبر ہے نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ خبر ثانی ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكَ بمعنی الذی ہو اور نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ اس کی خبر ہو، یعنی اَلَّذِی مِن انباءِ الغیب نوحیه إلیك یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف کے معاملے میں سے غیب کی خبروں میں سے جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ یعنی ہم اس وحی کے ذریعے آپ کو سکھاتے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ یعنی بھائی یوسف کے ساتھ آپ ان کے پاس نہیں تھے اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنے پر وہ متفق ہوئے وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ یعنی کنویں میں پھینکنے کے سلسلہ میں وہ یوسف کے ساتھ مکر کر رہے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود قمیص لاکر آپ کے ساتھ مکر کر رہے تھے یعنی وہ احوال آپ نے مشاہدہ نہیں کیے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مطلع کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ آپ کا خیال یہ تھا کہ جب عربوں نے اس قصہ کے متعلق پوچھا ہے اور آپ نے ان کو اس کے متعلق بتایا ہے تو وہ ایمان لے آئیں گے مگر وہ ایمان نہ لائے، تو یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے نازل ہوئی یعنی جس کو آپ ہدایت دینا چاہیں اس کو آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ حَرَصَ یَحْرِصُ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے اور ضعیف لغت میں حَرِصَ یَحْرَصُ بھی ہے یعنی باب سَمِعَ یَسْمَعُ اور حرص اختیار کے ساتھ کسی چیز کا مطالبہ کرنے کو کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ، مِنْ صلہ ہے یعنی ما تسالهم جعلاً، اِنْ هُوَ یعنی ماهو، هُوَ سے مراد قرآن اور وحی ہے اِلَّا ذِكْرٌ یعنی نصیحت اور تذکرہ لِّلْعٰلَمِیْنَ سب جہانوں کے لیے۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

"اور کتنی ہی (بے شمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشے) میں (سجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح و شام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کیے ہوتے ہیں اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیا وہ بے غم ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آئے ان پر چھا جانے والا اللہ تعالیٰ کا عذاب یا آجائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں، اور ہر عیب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ اور نہیں ہوں میں مشرکوں سے"۔

قولہ تعالیٰ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خلیل اور سیبویہ نے کہا: یہ أي ہے اس پر کاف تشبیہ کا داخل ہوا تو این بن گیا، یہاں یہ کم کے معنی میں ہے سورۂ آل عمران میں اس کے حوالے سے گفتگو گزر چکی ہے اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے حوالے سے سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیات گزشتہ امتوں کی سزاؤں کے آثار ہیں، یعنی وہ غافل تھے اور ان میں غور وفکر سے اعراض کرتے تھے۔ عکرمہ اور عمرو بن فائد نے وَالْاَرْضِ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ متبدا ہوگا اور اس کی خبر يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا ہوگی۔ سدی نے فعل کو مضمر مانتے ہوئے وَالْاَرْضِ پڑھا ہے۔ ان دونوں قرأتوں کے مطابق وقف السَّمٰوٰتِ پر ہوگا۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے يَمُرُّوْنَ کے بجائے یمشون علیها پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا اور سب اشیاء کا خالق ہے جبکہ وہ بوجا بتوں کی کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد، عامر، شعبی اور اکثر مفسرین کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (1) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو پیدا کرنے والا کون ہے تو ضرور کہیں گے: اللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا کلمات کہتے ہیں اور اس کے شریک بناتے ہیں۔ حضرت حسن سے یہ بھی مروی ہے یہ اہل کتاب ہیں ان کے پاس شرک وایمان دونوں ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لاتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفیر کرتے ہیں تو ان کے ایمان صحیح نہیں۔ ابن الانباری نے یہ روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت مشرکین عرب کے تلبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان کا تلبیہ یہ تھا۔ لبیک لا شریک لک إلا شریکا هولک تملکه وما ملک ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ تیرا شریک ہے جس کو تو نے اپنا شریک بنایا ہے تو اس کا مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی تو مالک ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ مشبهه ہیں اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں اور تفصیلی طور پر شرک کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، معنی یہ ہوگا وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ یعنی زبان سے ایمان لاتے ہیں مگر دل سے وہ کافر ہیں۔ یہ ماوردی نے حضرت حسن سے روایت کی ہے۔ عطا نے کہا: یہ دعا سے متعلق ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار خوشحالی میں اپنے رب کو بھول جاتے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو بڑے خلوص سے دعا مانگتے اس کی تفصیل ان آیات میں ہے وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ الآیہ (یونس: 22) اور انہوں نے گمان کیا کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ الایہ (یونس: 12) اور جب انسان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو دور کرنے کے لیے ہم سے دعا مانگتا ہے۔ اور ایک اور آیت میں ہے وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۞ (فصلت) اور جب اسے کوئی برائی لاحق ہو تو وہ لمبی چوڑی دعا والا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہلاکت کی نجات کے لیے دعا مانگتے ہیں اور جب اللہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو کوئی کہتا ہے: اگر فلاں نہ ہوتا تو ہم نجات نہ پاتے، اگر فلاں نہ ہوتا تو چور ہمارے پاس آ جاتے اور اس طرح کے کلمات کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمت،

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

فلاں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جوان کو چور سے بچایا ہوتا ہے اس کو کتے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔
میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی باتیں تو اکثر عام مسلمانوں سے بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت واقعہ دُخان کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ قحط کے سالوں میں اہل مکہ کو دھویں نے ڈھانپ لیا تو انھوں نے کہا: رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿﴾ (الدخان) اے ہمارے پروردگار! ہم سے عذاب کو دور فرما ہم ایمان دار ہیں تو یہ ان کا ایمان تھا اور عذاب کے چھٹ جانے کے بعد ان کا شرک، کفر کی طرف لوٹ گیا اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿﴾ (الدخان) تم لوٹ کر جانے والے ہو۔ لوٹ کر جانا ابتدا کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تو اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ کا معنی ہوگا: الا وھم عائدون۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ، غاشیۃ کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مُجللۃ کیا ہے یعنی ڈھانپا ہوا۔ مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو ان کو ڈھانپ لیتا ہو، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (العنکبوت: 55) جس دن ان کو ڈھانپ لے گا عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ لڑائی ہے جو ان کے لیے بپا ہوگی۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد کڑک اور پھڑ پھڑانے والی ہے۔ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ یعنی قیامت بَغْتَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کی اصل مصدر ہے۔ مبرد نے کہا: عربوں سے نکرہ کے بعد حال کے جملے آئے ہیں جیسا کہ ان کا یہ قول: وقع أمرهم بغتة و فجأة نحاس نے کہا: بَغْتَةً کا معنی مصیبت کا ایسی جگہ سے آنا ہے جہاں سے توقع نہ ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ یہ تاکید ہے بَغْتَةً کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ چیخنے والی لوگوں پر چیخے گی اس حال میں کہ وہ اپنے بازاروں اور اپنے مقامات پر ہوں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿﴾ (یٰسین) وہ ان کو پکڑے گی درآنحالیکہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي متبدا اور خبر ہیں یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے یہ میرا رستہ، سنت اور طریقہ ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ربیع نے کہا: سَبِيلِي سے مراد دعوتی ہے، یعنی میری دعوت، مقاتل نے کہا: اس سے مراد دینی یعنی مراد دین ہے۔ معنی سب کا ایک ہی ہے، یعنی وہ طریقہ جس پر میں ہوں اور جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں وہ جنت کی طرف لے جاتا ہے۔ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ یعنی حق اور یقین پر، اسی سے فلان مستبصر بھذا ہے۔ أَنَا تاکید ہے وَمَنِ اتَّبَعَنِي مضمر پر عطف ہے۔ وَسُبْحَانَ اللَّهِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرما دیجیے وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ میں ان مشرکین سے نہیں ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مدمقابل بناتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝١٠٩ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝١١٠

''اور ہم (نے رسول بنا) کر نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے، کیا یہ (منکر) لوگ سیر و سیاحت نہیں کرتے زمین میں تاکہ وہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان (منکرین) کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے، اور دار آخرت یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (اے سننے والو!) کیا تم نہیں سمجھتے جب (نصیحت کرتے کرتے) مایوس ہو گئے رسول اور وہ منکرین گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے اس وقت آ گئی ان کے پاس ہماری مدد۔ پس بچا لیا گیا (عذاب سے) جس کو ہم نے چاہا اور نہیں ٹالا جا سکتا ہمارا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یہ ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے تھے: لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (انعام: 8) کیوں نہ اترا اس پر فرشتہ، یعنی ہم نے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے، جن میں نہ کوئی عورت ہے نہ جن اور نہ کوئی فرشتہ، یہ اس روایت کی بھی تردید ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عورتوں میں چار نبی ہیں، حوا، آسیہ، ام موسیٰ اور مریم''۔ اس کے متعلق کچھ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى سے مراد مدائن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحراؤں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں سے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا کیونکہ دیہاتیوں میں جفا اور سختی کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ شہروں میں رہنے والے زیادہ عقلمند، حلیم، افضل اور زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ سے کبھی بھی نبی مبعوث نہیں فرمایا اسی طرح نہ جنوں اور عورتوں میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجا۔ حضرت قتادہ نے کہا: مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، سے مراد من اہل الأمصار ہے کیونکہ وہ زیادہ حلم اور علم والے ہوتے ہیں۔ علماء نے کہا: رسول کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ مرد ہو، آدمی ہو اور شہری ہو، آدمی کی شرط علماء نے صرف ان کے اس قول سے بچنے کے لیے لگائی ہے کہ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) وہ جنوں میں سے مردوں کی پناہ مانگتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا کیا یہ لوگ زمین میں سیر و سیاحت نہیں کرتے تاکہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے انجام کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یہ متبدا اور خبر ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ دار ہی آخرت البتہ کسی چیز کو خود اس کی طرف لفظی اختلاف کی وجہ سے مضاف کر دیا جاتا ہے، جیسے یوم الخمیس، بارحۃ الاولی وغیرہ۔ شاعر نے کہا۔

ولو أَقْوَتْ عليكَ دیارُ عَبْس عَرَفْتَ الذُّلَّ عِرفَانَ اليقِينِ (1)

عرفان بھی یقین ہی ہوتا ہے مگر عرفان اور یقین دو مختلف لفظ تھے اس لیے شاعر نے عرفان الیقین کہہ دیا ہے۔ مراد عرفاناً یقیناً ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 98

کسائی نے صلاۃ الاولی کے قول سے استدلال کیا ہے۔ اخفش نے مسجد الجامع سے استدلال کیا جبکہ نحاس نے کہا: اضافة الشئ الی نفسہ محال ہے، کیونکہ کسی چیز کی اضافت دوسری چیز کی طرف اس لیے کی جاتی ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کی معرفت حاصل ہو جائے سو عمدہ بات یہ ہے کہ الصلاۃ الاولی کہا جائے اور جس آدمی نے صلاۃ الاولی کہا اس کا مطلب عند صلاۃ الفریضۃ الاولی ہوگا۔ اس کو اولی اس وجہ سے کہا گیا کہ نماز کی فرضیت کے بعد سب سے پہلے یہی نماز ادا کی گئی اسی طرح سب سے پہلے جو سب سے زیادہ ظاہر ہوئی وہ بھی یہی ہے اسی وجہ سے اس کو ظہر بھی کہا جاتا ہے۔

تقدیر عبارت ہوگی، ولدار الحال الآخرۃ خیر یہ بصریوں کا قول ہے اور اس دار سے مراد جنت ہے اور خیر سے مراد ھی خیر للمتقین ہے۔ اس کو وَلَلدَّارُ الآخرۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ نافع، عاصم اور یعقوب وغیرہ نے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے خبر کے طور پر یعقلون پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ اس کی قرات اور معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا اس آیت کریمہ میں انبیاء کی ایسے امور سے تنزیہ اور عصمت بیان کی گئی ہے جو ان کے شایان شان نہیں۔ یہ باب بہت بڑا ہے اور اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے اس پر توقف کرنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان بھٹک جائے اور جہنم کا حقدار بن بیٹھے۔ معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا پھر ہم نے ان کی امتوں کو کوئی سزا نہیں دی حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ یہاں تک کہ رسول مایوس ہو گئے، یعنی اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے انبیاء نے گمان کیا کہ قوم کے جو لوگ ان پر ایمان لائے ہیں وہ ان کی تکذیب کریں گے نہ کہ قوم نے تکذیب کی بلکہ انبیاء نے گمان کیا کہ وہ ان کی تکذیب کریں گے (کہ رسولوں نے کافروں پر جس عذاب کا وعدہ کیا تھا وہ عذاب اب تک نہیں آیا) یعنی انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کے پیروکاروں کے دلوں میں شک داخل ہو جائے گا، تو اس طرح ظنوا کی اس سورت میں یہ تاویل ہوگی۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی، حضرت ابوجعفر بن قعقاع، حضرت حسن، حضرت قتادہ، ابو رجاء عطاری، عاصم، حمزہ، کسائی، یحییٰ بن وثاب، اعمش اور خلف نے كُذِبُوْا کو مخفف پڑھا ہے یعنی قوم نے یہ گمان کیا کہ ان کے رسولوں نے انہیں جو عذاب کی خبر دی تھی اس میں انہوں نے ان سے جھوٹ بولا ہے اور سچ نہیں بولا۔ ایک قول یہ ہے معنی یہ ہوگا ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو ان سے اللہ کی مدد کا وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا نکلا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ) یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ رسول ایسا گمان نہیں کر سکتا۔ اور جو ایسا گمان کرے وہ مدد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی؟ ابو نصر قشیری نے کہا: اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ بشر کے دل میں یہ بات کھٹکی ہو البتہ ان کے دلوں میں وہ محقق اور ثابت نہ ہوئی ہو، حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ایسی باتوں سے درگزر فرمایا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، جب تک زبان نے وہ بات کہی نہ ہو یا اس

پر عمل نہ کیا گیا ہو"(1)۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ کہا گیا ہو: وہ اس گمان کے قریب پہنچ گئے تھے جس طرح کہ آدمی کا قول: بلغت المنزل یعنی میں منزل کے قریب پہنچ گیا۔ ثعلبی اور نحاس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ بشر تھے اور لمبی آزمائش سے کمزور پڑ گئے اور بھول گئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرہ: 214) حتیٰ کہ رسول اور ایمان لانے والوں نے کہا: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ حکیم ترمذی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ تعالیٰ کی مدد کے وعدے کے بعد خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کا خوف زدہ ہونا اللہ تعالیٰ کے وعدے میں کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کے دلوں کی کمزوری کی وجہ سے تھا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو گئی ہو جس نے اس شرط اور وعدوں کو توڑ دیا ہو جو ان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ تو جب مدت طویل ہو گئی تو اس بنا پر نا امیدی اور گمانات در آئے۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، کہ بشری تقاضوں کے مطابق انبیاء نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہو گئی ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ: 260) سے آپ نے استشہاد کیا۔ (بہر حال) پہلی قرأت زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ مجاہد اور حمید نے قَدْ كَذَبُوْا کاف کے فتحہ اور ذال مخفف کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہو گا کہ قوم نے جب عذاب کی تاخیر میں اللہ کے فضل کو دیکھا تو رسولوں کی قوم نے گمان کیا کہ رسولوں نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو: جب رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے کفر اختیار کر کے اللہ پر جھوٹ بولا ہے تو رسول ہماری مدد کو لے آئے۔ بخاری میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ کے متعلق سوال کیا۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا: یہ كُذِّبُوْا ہے یا کذبوا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: كُذِّبُوْا۔ میں نے کہا: ان کو یقین تھا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے تو پھر گمان کیسا؟ آپ نے فرمایا: مجھے قسم انہیں یقین نہیں تھا۔ میں نے آپ کو کہا: وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! رسول اپنے رب کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا: تو اس آیت کا کیا مطلب ہو گا؟ آپ نے فرمایا: یہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی تھی وہ اللہ کی مدد آنے سے مایوس ہو گئے اور رسولوں نے یہ گمان کر لیا کہ اب ان کے پیروکار ان کی تکذیب کریں گے تو اس وقت ہماری مدد آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی مدد رسولوں کے پاس آ گئی یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی قوم پر اللہ کا عذاب آ گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک قول یہ ہے کہ انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں (کو نجات ملی) عاصم سے فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک نون اور یا مفتوح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مَنْ فعل مجہول کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ ابو عبید نے اس قرات کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر مصاحف میں ہے۔ ابن محیصن نے فنجا فعل ماضی پڑھا ہے۔ اور مَنْ فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، جبکہ باقیوں کی قرات کے مطابق مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَلَا يُرَدُّ

1۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 155

بَاْسُنَا یعنی عذابنا ہمارا عذاب نہیں ٹالا جا سکتا۔

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ یعنی کافرین و مشرکین سے۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

”بلاشبہ پہلی قوموں (کے عروج وزوال) کی داستانوں میں (درس) عبرت ہے سمجھداروں کے لیے، نہیں ہے یہ قران ایسی بات جو (یونہی) گھڑلی گئی ہو بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو ان سے پہلے نازل ہوئیں ہیں اور یہ قران ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت و رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ یعنی حضرت یوسف، آپ کے باپ اور بھائیوں کے قصہ میں یا قوموں کے قصوں میں۔ عِبْرَةٌ یعنی فکر، تذکرہ اور نصیحت۔ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی بہت زیادہ عقلمندوں کے لیے۔ محمد بن اسحاق نے عن زہری عن محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو چھتر سال زندہ رہے۔ اور آپ کے بھائی عیصو آپ کے ساتھ ایک دن میں فوت ہوئے اور دونوں ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ اس وجہ سے اللہ کا ارشاد: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ سورت کے آخر تک ہے۔ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰى یعنی یہ قران ایسی بات نہیں جو گھڑی گئی ہو یا یہ قصہ ایسی بات نہیں جو گھڑا گیا ہو۔ وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ یعنی جو اس سے پہلے ہیں تورات، انجیل اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتب میں سے۔ یہ تاویل اس آدمی کی نزدیک ہوگی جس کا خیال ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے، وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ ایسی چیزیں جن کی بندوں کو ضرورت ہوتی ہے حلال وحرام اور شرائع واحکام وغیرہ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔